جلد ۱۰۳ اپریل ۱۹۸۵ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۳	اپریل ۱۹۸۵ء مطابق رجب ۱۴۰۵ھ	عدد ۴

اشارات: جناب نعیم صدیقی صاحب ۲

حکمت سید مودودی

محاسبہ و تطہیر کا عمل (ادارہ) ۱۴

مقالات:

مسجد نبوی جناب شاہ بلیغ الدین صاحب ۱۸

اسلامی قانون سازی کا اہم ترین مسئلہ جناب محمد امین صاحب ۲۸

اسلامی تنظیم کی اہمیت اور اس کے تقاضے جناب سید اسعد گیلانی صاحب ۳۴

رسائل و مسائل:

مخلوط تعلیم اور پردہ پسند طالبات (جامعہ پنجاب کی ایک طالبہ کا خط) ۴۳

مطبوعات: (ادارہ) ۴۸

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرسالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اِن سطور کے لکھنے کا آغاز ۲۳ مارچ کے مبارک دن کو کیا۔

۲۳ مارچ کو ہماری زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی تاریخ تھی جب ۱۹۴۰ء میں بہ مقام لاہور قرار داد پاکستان منظور کی گئی۔ پھر اسی تاریخ کو پاکستان کا پہلا دستور (۱۹۵۶ء) نافذ ہوا۔ اور اب یہی تاریخ ہے جب پورے اٹھائیس برس اسکندر مرزا کا مختصر دور، ایوبی مارشل لا یحییٰ خان کا مارشل لا، بھٹو کے زمانے کا "عوامی مارشل لا" اور اذیت ناک "جمہوری آمریت") کے بعد بحالیٔ جمہوریت کی اسکیم کا نہایت اہم مرحلہ طے ہوا، یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء سے اسلام کے اُبھار اور غلبے کے ساتھ پاکستان کے استحکام و ترقی کا نیا دَور شروع کرے، وہ صدرِ مملکت، وزیراعظم، کابینہ، سپیکر، ڈپٹی سپیکر، سینیٹ کے صدر، جملہ نمائندگانِ جمہور اور علماء و عوام کو خواتین سمیت اپنے فرائض خدا و رسولؐ کی تعلیمات کے مطابق دیانت و عدل اور خلوص و بے لوثی کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ یہ رحم بھی فرمائے کہ موجودہ بحرانی حالات میں گھرے ہوئے پاکستان کی پارلیمانی فضا ہر قسم کے ناروا جوڑ توڑ، عالمِ بالا کی سازشوں، مفاد پرستیوں اور افراد، پارٹیوں، خاندانوں، علاقوں اور ہیود و کریسی کی تخریبی کشاکشوں، تیز پسِ پردہ ہر قسم کی غیر ملکی دخل اندازیوں سے محفوظ و مامون رہے۔ نمائندہ حکومت اور نمائندہ ایوان دونوں مل کر اختلافات واقع ہونے کے باوجود اتحاد و اعتماد کی فضا میں کام کریں اور پاکستان کے شہری بھی وحدت و اخوت کی

بنیانِ مرصوص ثابت ہوں۔

انتخابات ۸۵ء میں تحریکِ اسلامی کے علمبرداروں نے کیا پارٹ کیا اور جواب میں تحریک اسلامی کو کیا ملا، اس پر اجمالی اظہارِ حقائق سے قبل ایک تمہیدی گذارش ضروری ہے۔

ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دورِ ماسبق کی ملوکی ریاستوں یا باقاعدہ سیاسی نظام کے بغیر چلنے والے قبائلی معاشروں کے بالمقابل آج کے سیاسی طور پر منظم معاشروں اور اچھی طرح تسلط یافتہ حکومتوں میں بڑا فرق ہے۔ آج کے حالات میں کسی نظریہ و عقیدہ کے تحت تبدیلی لانے والوں کو اگر جمہوری نظام میں کام کرنے کا موقع ملے تو انتخابات تبدیلی لانے کا ذریعہ بھی ہو سکتے ہیں اور اس میں معاون بھی ہو سکتے ہیں۔ انتخابات عوام اور ووٹروں کے حلقوں میں بھی اور پارلیمانی دائرے میں بھی مختلف نظریات و مقاصد کے لیے اچھا میدانِ دعوت بھی اور حرکت افزا میدانِ کشمکش بھی فراہم کرتے ہیں۔ انتخابات اہلِ دعوت کے لیے شہریوں سے بالمشافہ ربط پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ بھی ہیں۔

اسلامی دعوت کے علمبرداروں کو انتخابی میدان میں یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ملک کی آبادی کو یہ تعلیم دے سکیں کہ اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے؟ ایک مسلم معاشرہ میں کیسی حکومت ہونی چاہیے؟ اہم دینی اور ملکی مسائل کیا ہیں؟ قیادت کا صحیح معیار کیا ہے؟ اور ووٹر کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں؟ یہ درست کہ انتخابات کے پرہنگامہ دور میں یہ دعوت مجمل اور سرسری ہوتی ہے، مگر غیر مؤثر ہرگز نہیں۔ پچھلے انتخابی تجربوں کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو ایسے ووٹروں کا عددی تناسب تواتر سے بڑھ رہا ہے جن کے ذہن اسلامی اصول و معیارات سے متاثر ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے سے دعوت و اشاعتِ دین کا جو گہرا اور وسیع کام ہوتا رہتا ہے ــ مثلاً دروسِ قرآن، اجتماعات، جلسہ ہائے عام، بیانات، پوسٹر اور ہینڈ بل اور ذاتی رابطے اور گفتگوئیں ــ ان سب کا اثر موجود ہوتا ہے، مگر اس طرح کے پھیلے ہوئے اثرات کو سمیٹ کر واضح اور متعین صورت میں سامنے لانے کا موقع انتخابات ہی میں ملتا ہے۔ اور خود انتخابی کام ان اثرات کو گہرا کرنے اور آگے بڑھانے میں بہت اثر ڈالتا ہے۔

ہمارا اب تک کا تجربہ یہ ہے کہ انتخابی ماحول میں کسی خاص صورتِ حالات کے تحت

ذہنوں پر اثر انداز ہونے والے سیاسی واقتصادی اور تہذیبی واخلاقی مسائل کے حوالے سے دینی اُصول واقدار کے لیے نتیجہ خیز کام کیا جاسکتا ہے۔ ایسا کام مجرد علمی مقالوں یا وعظوں سے سرانجام نہیں پاسکتا۔ اگرچہ یہ چیزیں دعوت کی مجموعی اسکیم میں اپنی جگہ ضروری ہیں۔ علاوہ ازیں متاثر ہونے والے عوام کو ان کی جگہ پر جامد چھوڑ دینے کے بجائے، چونکہ انھیں اپنے ساتھ کشمکش میں شریک کر لیا جاتا ہے، اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ ایک متعین حلقے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ بلکہ آگے کے ملیے مجاہدے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والے صحیح شہدائے حق اگر انتخابی میدان میں موجود ہوں تو وہ آہستہ آہستہ عوام کی ایسی تربیت کر سکتے ہیں کہ وہ برادری، علاقے، طبقے، فریب کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذاتی وگروہی مفاد پرستی کو چھوڑ کر اسلامی نظریہ قیادت کو قبول کر لیں۔[1]

اس ساری مہم کو چلانے کے لیے بس ایک ایسے منظم گروہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے

[1] انتخابی طریق کار کے متعلق ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ مطلوبہ انقلاب اپنی مکمل صورت میں لازماً پارلیمانی طریقے سے نمودار ہو سکتا ہے، بلکہ ہم بخوشی کسی معترض کے کہنے سے پہلے اعتراف کرتے ہیں کہ صدارتی یا پارلیمانی کسی بھی جمہوری نظام اور اس کے تحت ہونے والے انتخابات میں مخالف تخریبی رجحانات کا بہت دخل ہوتا ہے۔ اور ٹکراؤ کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ پس یہ دعوےٰ نہیں کیا جاسکتا کہ مجرد انتخابی عمل اور پارلیمانی نظام میں حصہ لینے کے نتیجے میں گوہرِ مقصود حاصل ہو سکتا ہے۔ ہماری رائے صرف یہ ہے کہ اس راستے سے دعوتِ اقامتِ دین کو پھیلانے اور اسلامی انقلاب کے لیے فضا کو سازگار کرنے کے لیے واضح مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ فضا جب اچھی طرح سازگار ہو جاتی ہے تو پھر رائے عام کے دباؤ سے آگے بڑھنے والا انقلابی عمل کا ریلا وقتی رکاوٹوں کو توڑ کر اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔ بڑی سے بڑی جمہوریت پسند تحریک کو بھی دوڑ لگاتے ہوئے کسی آخری مرحلے پر بند پھاٹک کو عبور کرنے کے لیے کوئی بڑی جست لگانی پڑ سکتی ہے۔ اس مرحلے کے متعلق سوچنا آج ہمارا کام نہیں، ہم تو جمہوری و آئینی راستے ہی سے آگے بڑھیں گے۔ ہمارا ابتدائی کام جب تکمیل کو پہنچے گا تو اس وقت وہ کام اپنا رہنما خود ہوگا۔

تمام افراد ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہوں اور اپنے موقف پر استقامت سے قائم رہیں۔

متذکرہ تمہیدی بات کا اب ذرا دوسرا پہلو!

اس معاملے میں ہمارا کوئی جھگڑا نہیں، اُن مخلص افراد یا گروہوں سے، جن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل چیز افراد کی اصلاح ہے، رہا اسلامی نظام کا قیام، سو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ انعام ہوتا ہے۔ اسی نظریے کی دوسری شکل یہ بھی ہے کہ پہلے معاشرہ تیار ہو لے، پھر اسلامی نظامِ اجتماعی کے قیام اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں سے دلچسپی لینے کا وقت آسکتا ہے۔ بغیر کسی منافرت و تصادم کے، ہماری رائے یہ ہے کہ زندگی کے چلتے ہوئے کاموں سے منقطع رہ کر ان کاموں کی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً یہ سوچنا کہ اس وقت تک کاروبار شروع نہیں کیا جاسکتا جب تک پوری مارکیٹ بدعنوانیوں سے پاک نہیں ہو جاتی۔ آخر لوگوں کے کاروبار کو قریب سے جانے سمجھے اور ان کے مسائل کا براہ راست تجربہ و مشاہدہ کیے بغیر ان کی صحیح رہنمائی کرنا اور اصلاح کے خطوط ان کے سامنے واضح کرنا کیسے ممکن ہے۔ اللہ کا جو بھی نیک بندہ کاروبارِ دُنیا سے کٹ کر کلمہ، نماز، ورد، وظیفہ، بیعت، وعظ، افتا اور درس کے اچھے اچھے مشغلوں میں مصروف رہتا ہے، کیا وہ اپنے کام پر اتنا اعتماد رکھتا ہے کہ طلبِ دولت اور حُبِ منافعِ کثیر کی مسابقت کے شدید دباؤ میں آئے ہوئے بے شمار کاروباریوں کو ان کی کشمکش میں وہ اتنی مؤثر مدد دے سکے گا کہ وہ لوگ بدعنوانیوں کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اس نیک جہاد میں وہ ہر نقصان خوشی سے برداشت کرلیں۔ عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بیعتیں بھی ہوتی ہیں، ذکر اذکار بھی چلتے ہیں، تہجد بھی پڑھے جاتے ہیں، تبلیغی دورے بھی جاری رہتے ہیں، مگر کاروبار کو اسمگلنگ[1]، سود، سٹے، ذخیرہ گری، چور بازاری، بیجا نفع اندوزی، ملاوٹ، مغالطہ دہی، غلط ناپ تول[2]، وعدہ خلافی، حصہ داروں کی باہمی خیانت، بعض متعلقہ

---

[1] اب تو اسمگلنگ کا انداز یہ رہا ہے کہ غیر ملکی اشیاء سرکاری ڈیوٹیوں کی ادائیگی کے بغیر کھلے بندوں شہر بہ شہر فروخت ہوتی ہیں۔

[2] غلط ناپ تول کی بیسیوں شکلوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کاغذ کے رباقی بر صفحہ آئندہ

سرکاری کارندوں کو رشوت دہی، جعلی حساب کی تیاری، انڈر انوائسنگ، پاکستان اور ہانگ کانگ اور سنگاپور کی بنی ہوئی چیزوں پر ساختہ جاپان کی مُہر کی چھاپ --- غرضیکہ خرابیوں کا ایک ایسا طوفان ہے کہ لوگ غوطے کھاتے ہوئے اس میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ کنارے سے اس طوفان میں غوطے کھانے والوں کی ہاشیری کرنے والے نیک آدمی کو سوچنا چاہیے کہ کیا اس کی کوششیں اُس صورت میں زیادہ نتیجہ خیز نہ ہوں جب کہ وہ خود بھی طوفان کے اندر اس کی موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے دھارے کے خلاف تیرنے کا جہاد کر رہا ہوتا اور دوسرے طوفان زدگان کو بھی اپنے استدلال اور اپنی مثال سے اس کی دعوت دے رہا ہوتا۔

معاشرے کے اندر لادینیت، بدعنوانی، مفاد پرستی اور بے حیائی کے طوفان کا زور مسلسل بڑھ رہا ہے اور طوفان کی موجیں اس کا انتظار کرنے کے لیے رکی نہیں رہیں کہ پہلے آپ کروڑ دو کروڑ افراد کو اس طوفان سے کہیں باہر رکھ کر اچھی طرح تیار کر لیں۔ اور ایک مستقل فکر و اخلاق کا مضبوط معاشرہ منظم کر لیں۔ آخر شیطانی قوتیں اس عرصے میں کام سے مستعفی یا معطل ہو کر تو نہیں بیٹھیں گی! وقت جتنا گذرتا جائے گا، کام اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا۔

سو ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زراعت کار زراعت کرتے ہوئے، معلم تعلیم دیتے ہوئے، کلرک ملازمت کرتے ہوئے، سیاست کار سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے اور "نیک آدمی" انتخابات میں حصہ لیتے ہوئے اپنی دینداری، اپنے اخلاق اور اپنے اسلامی نظریۂ حلال و حرام کے مطابق مخالف عوامل سے لڑنے کی کوشش کرے، اسی میں اس کے ایمان کا امتحان ہے۔ اسی طریقہ سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اصلاح کی رفتار تیز ہو سکتی ہے، اسی صورت میں ہر نوع کے مفید کارکن تحریکِ اقامتِ دین کو مل سکتے ہیں۔ اور اسی مجاہدانہ عمل کے تسلسل کے نتیجے میں وہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ اسلامی نظام پورے کا پورا عملاً برپا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ریم خریدیے تو کاغذ بلحاظ تعداد کم نکلیں گے اور کسی ریم کا وزن پورا نہیں ہوگا۔ نیز ایک ہی ریم کے تختوں میں دبازت اور رنگت میں فرق ہوگا۔ (یہ چیز ملاوٹ کی تعریف میں داخل ہے)۔

ہو سکے۔

ہماری تمہیدی گذارش جو ایک طویل جملہ معترضہ بن گئی، یہاں ختم ہوتی ہے۔

انتخابات ۸۵ء کے متعلق سب سے پہلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے سیٹوں کی گنتی کو الگ رکھ کر اس حقیقت پر نگاہ جمائیے کہ اب تک جو سیاسی عمل جمہوری ایوانوں کے قیام تک ہمیں لے آیا ہے اس میں ہمارا کیا حصّہ ہے ـــ اور ہماری پالیسی اور مرحلہ بر مرحلہ ہمارے فیصلے اپنے آخری نتائج کے لحاظ سے کس حد تک کامیاب ثابت ہوئے۔

دونوں مرکزی ایوانوں کے مشترکہ اجلاس اور بعد ازاں وزیر اعظم کے تقرر پر مرکزی اسمبلی کی طرف سے بالاتفاق اظہار اعتماد کے پُرمسرت لمحات کا پُرسکون طریق سے ظہور مستقبل کے لیے مبارک علامات ہیں اور اس سارے سفرِ جمہوریت میں کچھ ہمارا حصّہ بھی شامل ہے۔

ملک و قوم کے لیے ہماری طویل المیاد خدمت یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ پر اور اپنے حلقہٴ اثر پر مضبوطی سے قابو رکھ کر برسوں کی جمع شدہ قوت کو مارشل لا کے ساتھ تصادم کرنے سے روکے رکھا۔ اگر یہ قابو نہ رکھا جا سکتا تو فوجی اقتدار سے تصادم کے نتیجے میں یا تو جاری مارشل لا طوالت پکڑتا اور زیادہ سخت گیر ہو جاتا۔ یا اُس کے اندر سے ایک اور تازہ دم مارشل لا نکل آتا ـــ نیا مارشل لا قانونِ ضرورت کے تحت لاقانونیت کا ڈنڈا نظام کر سارا سبق از سرِنو الف با سے شروع کرتا اور زیادہ اندیشہ یہی ہو سکتا تھا کہ نئے مارشل لا کا رُخ بھی بالکل دوسری جانب ہوتا اور اس کا طرزِ معاملہ بھی مختلف ہوتا۔ بیچ میں ہم اس قوت کو جو خدا کی طرف سے ایک امانت تھی، مفت میں پِسوا لیتے۔ جس کے نتیجے میں وہ برسوں تک ماسوا تقدیر کا ماتم کرنے کے، کوئی مفید خدمت انجام دینے کے قابل نہ ہوتی۔

یہ باتیں محض خوف انگیز وساوس پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ عالمِ اسلام کے مختلف خطوں میں قریب کی تاریخ نے جو سبق ہمارے سامنے پھیلا دیے ہیں اُن کے حقیقت پسندانہ مطالعہ پر مبنی ہیں ـــ ان اسباق کا خلاصہ یہ ہے کہ فوجی حکومتوں سے لڑ بھڑ کر حصولِ مراد ممکن نہیں، ان سے عدمِ تصادم

کارویہ اختیار کر کے نسبتاً بہتر نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے خواہ رفتارِ پیش قدمی کم ہی کیوں نہ رہے۔ اسی کے ساتھ ہماری نگاہ ان خطرات تک بھی تھی جو دو طرفہ سرحدوں سے اس طرح جھانک رہے تھے (اور ہیں!)، جس طرح کسی جھاڑی کے پیچھے سے کوئی ریچھ یا چیتا جھانکتا ہے۔

اصل میں چھاپہ مار طریقوں کو الگ رکھ کر پابندِ آئین و اخلاق تحریکوں یا کم سے کم باقاعدہ منظم سیاسی جماعتوں کے لیے ماسوا جمہوری جدوجہد کے اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ مارشل لا کے تحت جب اسمبلیاں باقی نہ ہوں، سیاسی تنظیموں کو کالعدم کر دیا جا چکا ہو؟ پلیٹ فارم موجود نہ ہو، جلسوں کا انعقاد اور جلوسوں کا مارچ کرنا ممنوع ہو، پریس آزاد نہ ہو حتیٰ کہ عدلیہ تک کو ایسا مقام حاصل نہ رہے کہ وہ کسی معاملے میں حکمران قوت کی مرضی کے خلاف فیصلہ دے سکے تو پھر کسی مؤثر تصادمی جدوجہد کا نقشہ بنا کر اٹھ کھڑے ہونے کی جرأت کوئی ذی شعور تحریک یا جماعت تو نہیں کر سکتی۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی تنہا آدمی کسی مست ہاتھی سے ٹکر لینے کے لیے نکل کھڑا ہو۔

لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مرحلہ بہ مرحلہ پیش آنے والے واقعات نے کیسا کیسا دباؤ ہم پر ڈالا کہ ہم اپنے موقف کو بدل لیں۔ باہر سے بھی اور اندر سے بھی ہمیں کہا جاتا تھا کہ فلاں فلاں وجوہ سے ایک غلط کار قرار پانے والی حکومت کی سخت مخالفت کرنا شرعاً بھی اور اپنے نظریات و روایات کے لحاظ سے بھی اشد ضروری ہے۔ اسی طرح باہر سے بھی اور اندر سے بھی ہمیں یہ احساس دلایا جاتا کہ جماعتِ اسلامی حکومت سے تعاون کر رہی ہے اور اس کی بی ٹیم کی حیثیت میں ہے[1]۔ اِس وجہ سے بعد میں خراب نتائج بھگتنے ہوں گے۔ چنانچہ اکا دکا آوازیں اب بھی

---

[1] کاش کہ ان اوراق میں اتنی گنجائش ہوتی کہ قائدِ تحریک کے وہ خطوط اور بیانات اور ان کے مشیروں کی وہ قراردادیں یہاں پیش کی جا سکتیں، جن میں حکومت اور اس کے نظریات اور اس کی کارروائیوں نیز اس کی کوتاہ کاریوں اور غلط کارروائیوں میں اتنی سخت اور دوٹوک تنقید کی گئی ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے فرد یا گروہ نے کی ہوگی۔ نیز بار بار یہ واضح کیا جاتا رہا کہ ہم اچھے فیصلوں یا اقدامات کو اچھا بھی کہیں گے اور غلط فیصلوں اور کاموں کی غلطیوں پر گرفت بھی کریں گے۔

ایسی شناخت دیتی ہیں کہ جماعت کو حسبِ دل خواہ سیٹیں اس لیے نہیں مل سکیں کہ اس کو حکومت کا حامی سمجھا جاتا تھا۔ اور کوئی مخصوص صورت ایسی اختیار نہیں کی گئی کہ لوگوں کا یہ تاثر ختم ہو جاتا۔ گذشتہ دورِ آزمائش میں ایک رجحان یہ بھی چلتا رہا کہ حمایتِ حکومت کے الزام کو رفع کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ مارشل لا حکومت کے خلاف منافرت انگیزی کے کچھ نہ کچھ تصادمی انداز اختیار کیے جائیں۔

بہر حال ہم نے اپنی پالیسی جس ہدفِ مقصود کو سامنے رکھ کر بنائی اور ایک مباح نہایت مشکلوں سے نبھائی وہ یہ تھا کہ کسی طرح مارشل لا سے پُر امن طور پر اقتدار منتخب جمہوری ایوانوں کی طرف منتقل ہو جائے اور بیچ میں وہ طاقتیں کوئی خلل نہ پیدا کر سکیں جنہوں نے دو مختلف مرحلوں پر تخریبی کارروائیوں اور محاذ آرائی کے طریقے اختیار کر کے یہ چاہا تھا کہ انتقالِ اقتدار کا مرحلہ پُر امن طور پر طے نہ ہو سکے بلکہ بحرانی حالات پیدا کر کے مارشل لا کا صرف چہرہ بدلوا کر اسی کے ذریعہ قوم کو خود دبا لیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسے منفی رجحانات کو مکمل طور پر شکست ہوئی۔

پھر وہ ایک نازک موڑ تھا جب کہ ریفرنڈم کے متعلق رائے قائم کرنے کی ذمہ داری ہمارے سر عاید ہوئی۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم نے اس وقت اس معنی میں صحیح فیصلہ کیا کہ درِ جمہوریت کھلنے کی کلید قوم کو مل سکے[1] اس وقت کی فضا ہماری نگاہ میں ہے کہ نہ صرف

---

[1] بعض سیاسی دانشور جو پہلے ریفرنڈم کی مخالفت کر رہے تھے اور بعد میں ریفرنڈم کو ایک ڈھکوسلہ ثابت کرنے میں مصروف تھے (اور اب تک یہ مشغلہ جاری ہے)۔ ہمارے اس نقطہ نظر کو سمجھ نہ سکے کہ ریفرنڈم اصل مقصود تھا ہی نہیں، مطلوب تو انتخابات کا انعقاد اور اسمبلیوں کا قیام (اتنا کچھ عملاً ہو چکا ہے) اور مارشل لا کا خاتمہ تھا (جو فی الوقت باقی ہے)۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے انڈے کے وجود میں اصل قدر و قیمت چھلکے کی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس شے کی ہوتی ہے جو چھلکے کے اندر محفوظ ہوتی ہے۔ اصل شے کے حصول کے بعد چھلکا ٹوٹ پھوٹ کر کوڑے کا حصہ بن جاتا ہے۔ اب جو حضرات ریفرنڈم ہی کے قضیے میں اُلجھے ہوئے ہیں (باقی بر صفحہ آئندہ)

اخباری حلقوں بلکہ سیاست سے تعلق رکھنے والے بعض مذہبی حلقوں میں بھی محسوس کیا گیا کہ جماعتِ اسلامی بازی لے گئی۔ ہمارا فیصلہ وہ واحد فیصلہ تھا جس پر حکومت کی نگاہیں بھی مرتکز تھیں اور عوام کی توجہات بھی منعطف تھیں۔ کسی کے لیے یہ پیش قیاسی کرنا ممکن نہ تھا کہ کیا فیصلہ ہونے والا ہے اور جب فیصلہ ہو گیا تو جیسے تبدیلی کی ساری مہم میں جان پڑ گئی۔ اس وقت اگر ہم مخالفت کر کے تبدیلی کے امکانات کی فضا کو خراب کرنے والوں کے ساتھ شریک ہو جاتے تو ہو سکتا ہے کہ حالات کا دھارا کسی اور طرف بہہ نکلتا۔ خود ہم نہ ادھر کے رہتے نہ اُدھر کے۔ نہ حکومت کے ساتھ چلنے والے عناصر ہمارے قریب آسکتے اور نہ ہم مخالف عناصر کا ساتھ دے سکتے۔ اِس فیصلے کے بعد انتقالِ اقتدار کے مجوزہ عمل کی مخالفت کرنے والے لوگ جامد اور غیر مؤثر بائیکاٹ سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔

پھر مختلف حلقوں کی طرف سے اُٹھائے جانے والے ہزار قسم کے شکوک و شبہات اور اندیشوں کے باوجود ہم نے انتخابات میں حصہ لے کر عوام میں اس رَو کو تیز تر کیا کہ انتخابات جیسے بھی ہو رہے ہیں اور دستوری نظام کی جو بھی شکل بنتی نظر آتی ہے، اس کے باوجود آگے بڑھا جائے، کیوں کہ عوامی نمائندوں سے تشکیل پانے والے ایوانوں میں اتنی قوت ہو گی کہ وہ نقشۂ احوال کو بدل سکیں۔ یہ فیصلہ عوامی رجحانات کے ساتھ اتنا ہم آہنگ تھا کہ اُمیدواروں کی بھی قطاریں لگ گئیں اور ووٹر بھی ہجوم در ہجوم نکل کھڑے ہوئے بلکہ بات یوں "تیری جوانی" تک پہنچی کہ بائیکاٹ کرنے والی پارٹیوں کے نمایاں اور غیر نمایاں اصحاب بھی کثیر تعداد میں ضبط و نظم کی زنجیریں توڑ کر انتخابات کے سیاسی رقص میں اس طرح شامل ہو گئے جیسے مولانا روم کی حکایت کا دیہاتی اپنا گدھا گنوا کر نادانی کے عالم میں اس بول پہ ناچ رہا تھا کہ "خر برفت و خر برفت و خر برفت۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ان کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ اب جبکہ جمہوری ایوان قائم ہو چکے ہیں، ریفرنڈم کا موضوع ہی ختم ہو چکا ہے۔ اصل مطلوب تو تھا ہی جمہوری ایوانوں کا قیام، "تاکہ وہ مارشل لا کو حسن و خوبی سے رخصت کر سکیں۔"

اور اس رحمتِ ربی پر ہمیں بہت مسرت ہے کہ بغیر اس کے کہ انتخابات میں کوئی تخریبی کارروائی ہو سکی ہو، اور بغیر اس کے کہ عوام میں بائیکاٹ کا واضح رجحان پیدا کیا جا سکا ہو، اور بغیر اس کے کہ صدر کی حلف برداری، وزیر اعظم کے تقرر اور اس پر اظہار اعتماد کے مرحلوں میں کوئی بحران انگیز لہر اُبھر سکی ہو، آج جمہوریت کی گاڑی آغاز سفر کر چکی ہے[1]

لوگوں کے یہ اندیشہ ہائے دُور و دراز بھی غلط ثابت ہو گئے کہ حکومت لسٹ بنا کر اپنی پسند کے افراد کو کامیاب کرائے گی اور جو امیدوار خارج از فہرست ہوں گے ان کو ناکام کرا دے گی - یعنی سب کچھ ایک ڈرامہ ہو گا - حکومت کے پسندیدہ وزراء اور فوجی افسران کی اچھی خاصی تعداد شکست کھا گئی - بعض ایسے ایسے اُمیدوار کامیاب ہوئے کہ جن کا انتخابی مہاسنہ کے دوران میں بھی کسی کو امکان نظر نہ آتا تھا — دولت ضرور استعمال ہوئی — بدعنوانیاں بھی ہوئیں، مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انتخابی عمل کی ڈور کا سرا حکومت کے ہاتھ میں تھا -

آج ہم اپنی ٹھنڈی پالیسی اور اپنے متوازن فیصلوں پر اس لیے خوشی محسوس کر رہے ہیں کہ ہم نے صدقِ دل سے جس صورت کو ملک کی مفید خدمت سمجھا تھا وہ عمل میں آ گئی - سچی بات یہ ہے کہ اگر ہمیں ایک بھی سیٹ نہ ملی ہوتی تو بھی وسیع معنوں میں ہمیں اللہ تعالیٰ نے جو کامیابی عطا فرمائی ہے اس کے لیے ہم اس کے شکر گذار ہیں -

اب بڑا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد جس خوشگوار رابطے سے صدارت و وزارت کے دَور کا آغاز ہوا ہے، اس کے پیش نظر ہمیں یقین ہے کہ وہ وقت دُور نہیں جب کہ بنیادی حقوق قوم کو واپس مل جائیں گے، عدلیہ کا وقار و اختیار پوری طرح بحال ہو جائے گا - پریس پر سے ناروا پابندیاں ہٹ جائیں گی، سیاسی جماعتیں بحال ہو جائیں گی - اور مارشل لا اندیشوں کے

---

[1] ہمیں یہ اندازہ ہے کہ پس پردہ کچھ ایسی قوتیں دم سادھے موجود ہیں کہ حالات اگر ذرا بھی گنجائش دیں تو وہ اب تک کے قیمتی حاصلِ مساعی کو پل میں ملیامیٹ کر کے پاکستان کو تاریک گڑھے میں دھکیل سکتی ہیں - مگر اُمید ہے کہ خدا انہیں ایسی ہمت نہیں دے گا -

بحالت جلد اُٹھا لیا جائے گا۔ صدر اور وزیر اعظم کے توازنِ اختیارات کا معاملہ بھی ترمیمات کے قیود سے نکل کر عملی تعبیر و روایت کے لحاظ سے زیادہ معتدل شکل میں سامنے آئے گا۔ اور اس معتدل شکل کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ ترامیم میں بھی ایوان ضروری ترامیم کر سکے گا۔ یہ چیزیں کسی بحرانی صورتِ حالات سے بچنے کے لیے ضروری ہیں اور موجودہ ملکی حالات میں بحران سے بچنے کا جذبہ ہی توازن پیدا کرنے کا باعث بنے گا۔

آئیے اب انتخابات ۱۹۸۵ء میں کالعدم جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی حاصل کردہ سیٹوں کا جائزہ لیں۔ فی الحال سرسری معلومات پیشِ خدمت ہیں:۔

قومی اسمبلی میں حاصل کردہ نشستیں:

۱۔ صوبہ پنجاب سے = ۴
۲۔ صوبہ سرحد سے = ۴
۳۔ صوبہ سندھ سے = ۲
۴۔ صوبہ بلوچستان سے = ۱
میزان = ۱۱

سینیٹ میں:

۱۔ صوبہ پنجاب سے = ۱
۲۔ صوبہ سرحد سے = ۱
۳۔ صوبہ سندھ سے = ۱
۴۔ صوبہ بلوچستان سے = ۱
میزان = ۴

صوبائی اسمبلیوں کی نشستیں:

۱۔ صوبہ پنجاب سے = ۹
۲۔ صوبہ سرحد سے = ۶
۳۔ صوبہ سندھ سے = ۷
۴۔ بلوچستان سے = ۱[1]
میزان ۲۳ - ۱ = ۲۲

کل تعداد = ۳۷

---

[1] بلوچستان سے کالعدم جماعتِ اسلامی کے منتخب نمائندے مولینا عبدالحق نے بیک وقت قومی اور صوبائی سیٹیں جیتی تھیں۔ بعد میں انہوں نے صوبائی سیٹ چھوڑ دی اسے منہا کر دیا گیا ہے۔

یہ پہلا موقع ہے کہ مرکزی اور صوبائی تمام ایوانوں میں جماعت کے نمائندے موجود ہیں اور یہ پہلا موقع ہے کہ لاہور جیسے شہر سے ہمارے دوست کامیاب ہوئے ہیں۔

ذیل میں ہم جماعت کے حق میں پڑنے والے ووٹوں کے تدریجاً بڑھتے ہوئے تناسب کا خاکہ پیش کرتے ہیں:-

سنہ ۱۹۷۰ء ۔ جملہ ملکی ووٹ = ۱۹۳۷۱۸۳

جماعت کے حاصل کردہ ووٹ = ۹۴۵۲۷۵ حاصل کردہ ووٹوں کا تناسب = ۶٪

سنہ ۱۹۸۵ء (ملک تقسیم ہونے کے بعد)

جماعت کے حاصل کردہ ووٹ = ۱۱۷۰۷۲۹ حاصل کردہ ووٹوں کا تناسب = ۱۲٪

اب صوبہ وار تفصیلی نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔

	۱۹۷۰	۱۹۷۷	۱۹۸۵
صوبہ سرحد =	۱۰۳۹۳۵	۱۳۳۳۶۲	۱۹۷۲۱۱
صوبہ پنجاب =	۵۱۵۴۳۸	۷۹۲۵۳۵	۶۸۶۵۰۶
صوبہ سندھ =	۳۲۱۴۷۱	۲۹۳۹۶۷	۲۵۵۸۲۴
صوبہ بلوچستان =	۴۳۳۱	—	۳۱۱۸۸
میزان =	۹۴۵۲۷۵	۱۲۱۹۸۶۵	۱۱۷۰۷۲۹

اب جماعت کے ارتقا کو ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ مختلف انتخابات میں حاصل شدہ سیٹیں یہ تھیں:-

۱۹۵۱ء (پہلی بار) = قومی اسمبلی ۱ نمائندہ

۱۹۶۲ء = ۴ نمائندے (قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان سے)

۱۹۶۵ء = ۲ نمائندے (مغربی پاکستان کی اسمبلی میں)

۱۹۷۰ء = ۴ نمائندے قومی اسمبلی کے لیے مغربی پاکستان سے)

۱۹۷۷ء = ۹ نمائندے منتخب ہوئے (مگر انتخابات کالعدم قرار پائے)

۱۹۸۵ء = قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی جملہ ۲۷ نشستیں۔

اس قسم کے اعداد و شمار ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری قوت چونکہ برادریاں اور دولت یا جاگیریں نہیں ہیں، بلکہ اصول و مقاصد ہیں، لہٰذا ہمارے لیے یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ ہماری رفتارِ دعوت اور انتخابی ارتقاء دونوں متوازی طور پر چل رہے ہیں یا نہیں۔ ہمارے لیے یہ بڑی ہمت افزا بات ہے کہ ہماری انتخابی اور پارلیمانی قوت ہماری دعوت کے پھیلاؤ کے تناسب سے بڑھ رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے بنیادی دعوتی کام کی رفتار سے مطمئن نہیں ہیں اور اس سلسلے میں ہمیں بڑے اور جامع پروگرام کے تحت نئی رفتار سے سرگرم عمل ہونا ہے۔

مخالفین میں سے بعض نے یہاں سے لے کر بی بی سی تک خوب شور مچایا کہ جماعت اسلامی مار کھا گئی۔ پروپیگنڈے میں وقتی طور پر بڑا زور ہوتا ہے۔ اس کے اثر سے بعض اپنوں کا ذہن بھی متاثر ہوا۔ یہ اپنے نور روایتی آدھے گلاس والے چکر میں پڑ گئے کہ صد افسوس، گلاس نہ بھر سکا، حالانکہ دوسری طرف ہم لوگوں کا یہ اطمینان بخش نقطۂ نظر تھا کہ وہی گلاس جس میں پینڈے کی چند بوندوں سے زیادہ کبھی کچھ نہ ہوتا تھا، الحمدللہ کہ آج آدھا بھر گیا ہے۔ مخالفین سے تو کیا تعرض، ہم اپنے افسوس کرنے والوں کے دلِ اندوہگیں کی حالت دیکھ کر افسوس کرتے ہیں۔

دراصل ہم ہی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پارلیمنٹری دائرے میں ذمہ داری کا کتنا بھاری بوجھ ہمارے سر پر آ پڑا ہے۔ ہر اسمبلی میں اپنی ٹیم کو سنبھالنا، ان کی تربیت کرنا اور اس سطح کی قسم قسم کی مصروفیات کے لیے اُن کو تیار کرنا، اور ایوانوں سے باہر عوام میں اُن کو سرگرم عمل رکھنا، کارکنوں کی مدد ان کو بہم پہنچانا۔ اور انہیں اپنے اصول و مقاصد، منشور اور نظم کی حدود میں رکھنا اتنا بھاری کام ہے کہ اس کے لیے ہماری بیرونی افرادی اور وسائلی قوت کی خاصی مقدار چاہیے۔

جمہوری و پارلیمانی کام کرنے والوں کے لیے تدریج ہی کا راستہ مناسب ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ پہلی ٹیمیں تیار ہوتی جاتی ہیں اور پیچھے سے نئی کمک پہنچتی رہتی ہے۔ عددیت سے زیادہ اہم پارلیمانی کام کا معیار ہوتا ہے۔ پارلیمانی امتحان میں اگر شاندار کامیابی حاصل نہ ہو تو سیٹوں کی عددیت کسی جماعت کو قوت و وقار نہیں دلوا سکتی۔

پس اپنی موجودہ قوتوں اور وسائل کے لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ کا کرم ہے کہ اُس نے ہمارے کندھوں پر ہماری بساط سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ دوسری طرف ایسی حالت میں بھی نہیں رکھا کہ ہم ایوانِ جمہوریت میں اپنے آپ کو بے وقعت محسوس کرتے۔ سبحٰن اللہ جلیل القدسِ عظیم الاحسان!

پھیلاؤ چاہنے والی تحریک کی حیثیت سے ہمیں ایک اور بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے کارکن جن کو تعطلِ سیاست اور شکستِ نظم کے بعد ایک غیر محسوس سا جمود چمٹ گیا تھا، وہ انتخابات کا بگل بجتے ہی جب میدان میں نکلے تو پھر انہوں نے عوام میں نفوذ کی مہم اس زور سے چلائی کہ اگلی پچھلی کسر نکال دی۔ یہ سپاہیانِ تحریک اپنی دوسری مصروفیات کو سمیٹ سکیڑ کر اور آرام کو تج کر گلی گلی میں گھوم گئے اور ایک ایک دروازے پر دستک دے کر اپنے ہر حلقہ انتخاب میں چند دن کے اندر کئی کئی ہزار شہریوں سے ملاقاتیں بھی کیں اور مقصد کی باتیں بھی کیں۔ اس "گرداوری" کے جو نتائج سامنے آئے انہوں نے کارکنوں کے حوصلے بلند کر دیے۔ ایک تو ان کے تجربے میں یہ بات آئی کہ زیادہ تر "انتخابی" لوگوں نے اُوپر اُوپر کے گٹھ جوڑ میں اپنے آپ کو مصروف رکھا، ذرا نیچے کوئی گیا بھی تو کسی مقامی یا محلہ دار لیڈر یا زمیندار چوہدری یا کارخانہ دار یا نمبردار یا غنڈہ ٹیم کے سربراہ سے معاملہ کر لیا۔ براہ راست ووٹروں تک اور خصوصاً شہروں کے غریب محنت کاروں، چھوٹے ملازموں اور خوانچہ فروشوں تک سوائے جماعت اسلامی کے کم ہی کسی کے کارکن پہنچے۔۔۔ اور کہیں کہیں جو پہنچے وہ بھی نہ کوئی خاص پیغام رکھتے تھے، نہ نظم، نہ کردار۔ ان کی تو بس ایک ہی پکار تھی کہ ہمیں ووٹ دو، لیکن کوئی روشن قسم کی دلیل ساتھ نہ تھی کہ ووٹ کیوں دو۔ نہایت حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ان فربہ نوردیوں اور کوچہ گردیوں میں جہاں عام لوگوں کی طرف سے اعتراف کیا گیا کہ ہمارے پاس اس طرح کوئی نہیں آیا، وہاں بڑی تعداد ایسی نکلی کہ جو جماعت کو جاننے والی تھی اور اس کے لیے اچھا تاثر رکھتی تھی۔ ان میں سے خاصے لوگوں نے ووٹ دینے کے وعدے بھی

کیے اور ان کو پورا بھی کیا بلکہ کہیں کہیں تو کارکنوں کے ساتھ ہو کر کام میں لگ گئے۔ آپ ذرا جیتنے اور ہارنے والے تحریکی دوستوں کے ووٹوں کی تعدادوں کو دیکھیے، وہ ہمارے جانے پہچانے کارکنوں کی تعداد سے بیسیوں گنا زیادہ ہیں۔ برادریوں اور گروہوں کے دباؤ، مخالفانہ پروپیگنڈے کے زور اور روپے کی طاقت کے سامنے اتنی مضبوطی سے کھڑے ہونے والے شہری اگر اس تناسب میں موجود ہیں تو پارلیمانی دائرے میں اسلام کا معرکہ مزید چند برس میں سر کر لے جانا کوئی مشکل نہیں۔

لیکن اس خوش آئند صورتِ حالات نے بہت بڑی ذمہ داری ہم پر ڈال دی ہے اور وہ یہ کہ جو رابطے ہم نے انتخابی مہم میں پیدا کیے ہیں ان کو برقرار رکھیں اور اچھے لوگوں کی جو تعداد سامنے آ رہی ہے اُسے سمیٹیں۔ اس غرض کے لیے قریہ نوردیوں اور کوچہ گردیوں کا جو سلسلہ ہمارے بنیادی طریقِ کار کا جزو تھا اور جسے ہم نے مدت بعد تازہ کیا ہے۔ اسے مسلسل آگے بڑھانے کی منصوبہ بندی کریں۔

ورنہ ہمارا حال اس کسان کا سا ہوگا جو جان مار کر لمبے چوڑے کھیت میں ہل چلائے، پھر بیج کا "چھینٹا" دے۔ اور پھر بھول بھلا کر کئی برس تک اُدھر کا رُخ نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ زمین فصل دینے کے بجائے مُردہ ہو جائے گی۔ اپنے کاتے ہوئے سوت کے لچھے بنانے کے بجائے اسے جھیر جھیر کر دینا عقل و دانش کی راہ نہیں۔

اور مزید برآں ہمارے لیے ایک خوشگوار تبدیلی یہ ہے کہ "اسلام اسلام" کی جو پکار کئی سال سے جاری رہی ہے، پھر ریفرنڈم کے موقع پر پبلک نے جس شان سے تحریک پاکستان کے دور کے جذبات کا اظہار کیا ہے اور پھر خود انتخابات ۸۵ء کے دوران میں ہر اُٹھنے والے نے (خواہ وہ کسی طبقے اور سطح سے تعلق رکھتا ہو) ووٹروں کے سامنے نفاذِ اسلام کے وعدے کیے ہیں۔ اِن کی وجہ سے نئی اسمبلیوں میں اچھا خاصا عنصر سچے اسلامی جذبات کے ساتھ آیا ہے اور بقیہ لوگ بھی کم سے کم ظاہر کی حد تک اسلامیت کے حق میں ہیں (یا صریحاً مخالفِ دین نہیں ہیں) ان منتخب افراد میں اگر محبت و حکمت سے کام کیا جائے تو معتدبہ قوت غلبۂ اسلام کی کوششوں کے پلڑے میں اپنا وزن ڈال سکتی ہے۔

(باقی بر صفحہ ۵۱)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

محاسبہ و تطہیر کا عمل

"جمود کا دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کو درست رکھنے کے لیے ابتدا سے محاسبہ و تنقید اور اصلاح و تطہیر کا جو طریقہ رکھا گیا تھا اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا گیا ہو۔ اِس طریقے کو مقرر کرنے کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جماعت میں جہاں کوئی خرابی پیدا ہو رہی ہو اُس کا بر وقت نوٹس لیا جائے اور اُس کو رفع کیے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ جو شخص بھی سست پڑ رہا ہو یا غلط روش پر چل پڑا ہو، بلا تاخیر اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ اور اصلاح نہ ہو سکے تو اُسے رخصت کر دیا جائے۔ اگر یہ کام برابر ہوتا رہے تو جماعت میں ہمیشہ تطہیر کا عمل جاری رہے گا اور اس کے اندر غلط قسم کے آدمی نہ رہنے پائیں گے۔ غلط قسم کے آدمیوں کا جماعت میں موجود ہونا بہر صورت نقصان دِہ ہے۔ وہ اگر فعال نہ بھی ہوں تو ان کی چھوت رفتہ رفتہ دوسروں کو لگتی چلی جاتی ہے۔ اور اگر غلط ہونے کے ساتھ فعال بھی ہوں تو ان کی ساری سرگرمیاں اس کام میں صرف ہوتی ہیں کہ جس بیماری میں خود مبتلا ہیں اُسے ساری جماعت میں پھیلا دیں۔ اِس طرح کے آدمی جہاں بھی موجود ہوں فوراً اُن کا محاسبہ کیجیے۔ پھر یا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گے، یا انہیں جماعت سے نکلنا پڑے گا۔ جماعت کو صحت مند رکھنے کے لیے یہ عمل جاری رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس میں آپ تساہل سے کام لیں گے تو آئے دن آپ کو پریشان کن مسائل سے سابقہ پیش آتا رہے گا۔"

(تصریحات۔ ص ۲۷۳)

مسجدِ نبویؐ

جناب شاہ بلیغ الدین صاحب

(۲)

معمارِ حرم | اُس زمانے میں مسلمان مظلوم اور غریب تھے۔ اجتماعی عبادت کے مقصد اور میل جول کے لیے ایک مرکزی مقام کی ضرورت کو بہت سادہ طریقے پر پورا کیا گیا۔ اُس وقت صرف دو چیزیں پیش نظر تھیں۔ دھوپ سے بچاؤ ——— سکون اور سکوت!!

سرورِ کائناتؐ نے خود بنفسِ نفیس مسجدِ نبویؐ کا ایک خاکہ سوچا۔ پھر آپؐ نے خدا کا نام لے کر اس کی تعمیر شروع کی۔ سوچیے وہ بھی کیا وقت ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا ایسا برگزیدہ بندہ جس کی عظمت و جلال کے آگے دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ کی شان و شوکت بھی ہیچ تھی، پتھر اور مٹی ڈھو رہا تھا اور اپنے ہاتھوں سے مسلمانوں کی پہلی عبادت گاہ کی داغ بیل ڈال رہا تھا۔ کبھی دستِ مبارک مٹی میں اٹے ہوتے، کبھی لباسِ مقدس پر داغ دھبے پڑ جاتے۔ اُس وقت مسلمانوں کے پہلے اور دنیا کے سب سے بڑے عمارت ساز (آرکی ٹیکٹ) کی شخصیت نمایاں ہوئی۔ آپ ہی نے سب سے پہلے رہائشی حجرے بھی بنائے اس لیے دینی اور دنیاوی عمارت سازی کی ابتداء اسلام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی۔

پہلے مستطیل اور چوکور نقشے پر مسجد بنائی گئی۔ ہر دیوار خطِ مستقیم پر بنی تھی۔

دیواروں کے زاویے قائمہ تھے اور صفیں سیدھی۔ اسلامی فنِ تعمیر میں ہندسی ترتیب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی فنِ تعمیر میں مسلمانوں کے ایمان اور اعتقادات کی پوری جھلک بھی نمایاں ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ابتدائی تعمیرات میں سادگی میں حسن پیدا کیا۔

ہندسی ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ عقل جذبات پر حاوی ہے۔ دیواریں زاویہ قائمہ پر بنی ہوتی ہیں۔ یعنی اسلامی زندگی میں ہر بات ترتیب اور توازن سے ہوتی ہے۔ خطوط کے سیدھے ہونے کا مطلب نظم و ضبط کو بھی ظاہر کرنا ہے اور اس میں مساوات کا درس بھی دیا گیا ہے۔ محمود و ایاز کے لیے ایک ہی صف ہے امام مرکز میں ہوتا ہے۔ صفیں بالکل امام کے پیچھے بنائی جاتی ہیں تاکہ جماعت اپنے امام سے قریب سے قریب تر رہے۔

ع قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی

مسجد وسیع بنائی گئی تھی۔ صحن بہت کشادہ چھوڑا گیا تھا۔ روشنی اور ہوا کے لیے معقول انتظام کیا گیا تھا۔ وسعت اور کشادگی میں اسلامی عقیدوں کے پھیلاؤ اور خدا کی بندگی، بڑائی اور ہر جگہ موجود ہونے کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔ بہت سے مذہبوں کی عبادت گاہوں میں روشنی کی کم سے کم گنجائش رکھی جاتی ہے۔ اور اندھیرے سے ایک پُراسرار کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارے عقیدے کی بنیاد نہ خوف پر ہے نہ حیرانی پر۔ ہر بات واضح اور ہر تصور روشن ہے ___ سمجھو، پرکھو اور مانو! زبردستی کا کوئی پھندا گلے میں نہیں۔

بہت سے مذاہب کی عبادت گاہوں کی یہ صورت ہے کہ وہ درختوں کے جھنڈ اور قدرتی مناظر سے دب جاتی ہیں۔ مسجدیں اپنے طرزِ تعمیر سے اردگرد کے مظاہر کو دبا لیتی ہیں۔ کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قادرِ مطلق کی ذات سب پر غالب ہے۔ اور اس کے ماننے والے کائنات کو اپنی مٹھی میں دبا لیتے ہیں۔

ع مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

مسلمان کا عقیدہ اور مسلمان کا مزاج دونوں ہمارے طرزِ تعمیر میں ظاہر ہوتے ہیں۔

حسنِ تعمیر مسجدِ نبویؐ کی بنیاد سے لے کر جامع مسجد دمشق کے بننے میں اسّی بیاسی برس کا فرق ہے۔ اس دوران میں اسلامی فنِ تعمیر کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد سے مسلمانوں کے طرزِ تعمیر میں دل کشیوں کا اضافہ ہونے لگا۔ مسجدِ نبویؐ کی جو توسیع حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی اس میں یہ فرق واضح ہے۔

حالات بدلے تو سادگی اور سکون کے ابتدائی تصورات کی جگہ مسجدوں کی تعمیر میں طبعی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی ضروریات نے لے لی۔ طبعی ضرورت یہ تھی کہ ایک سکون والی جگہ ہو، جہاں دل لگا کر خدا کی عبادت کی جاسکے ___ سر پر سایہ ہو ___ بارش اور ہوا کے جھکڑوں سے بچاؤ رہے۔ مذہبی ضرورت میں سب سے پہلی بات یہ تھی کہ سب کے لیے عبادت کا ایک مرکز ہونا چاہیے۔ ایک ایسی جگہ جہاں مسلمان پہنچیں تو بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہو جائیں۔ پھر سوال یہ تھا کہ اذان کی آواز زیادہ سے زیادہ دُور تک کس طرح پہنچائی جائے۔ امام کی قرأت آخری صفوں تک کس طرح سنائی دے۔ سمتِ قبلہ کے لیے پتھر کی جگہ کوئی دل آویز نشان ہو۔ خطیب دُور دُور تک دکھائی دے اور اس کی آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ اس غرض کے لیے مینار، محراب اور منبر کا اضافہ ہوا۔ وضو کے لیے حوض بنائے گئے۔ طہارت خانوں کا اضافہ کیا گیا اور بھی کئی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا۔ اصحابِ صُفّہ کی یاد میں مکتب کی گنجائش رکھی گئی۔ اُستادوں اور طالب علموں کے رہنے کے لیے حجروں کا بھی موقع نکالا گیا۔ یہ ایک بڑی معاشرتی ضرورت بھی تھی۔ سیاسی ضرورت میں شان و شوکت، جمال و جلال کے مظاہروں کا عمل دخل ہو گیا۔ مغلوب قوموں کو یہ احساس دلانا بھی تھا کہ ہماری عبادت گاہیں کیسی خوب صورت اور کیسی باوقار عمارتیں ہیں۔ یہیں سے گنبد، کلس، کمانیں اور طاق، استرکاری

زینت کاری، گل کاری اور طغریٰ نمائی کی حسین بارہ یکساں فنِ تعمیر میں در آئیں۔ دمشق کی جامع مسجد کبیر کو ولید نے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہی نہایت تکلّف سے سجایا تھا۔ مسجدِ اقصیٰ، مسجد قرطبہ سے لے کر مسجدِ قوت الاسلام، جامع مسجد دہلی، مکہ مسجد حیدر آباد دکن اور شاہی مسجد لاہور سب میں یہی مصلحت نمایاں ہے۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی شان و شوکت کا مظاہرہ ان مسجدوں کے نتھرے ستھرے امتزاجِ جلال و جمال ہی میں ہے۔ یعنی یہ نظر کو بھانے والی بھی ہیں اور دل پر اثر کرنے والی بھی!

نئی روایات علم و تہذیب مسلمانوں کی میراث ہیں۔ حکم ہے جہاں سے یہ نعمتیں ملیں انہیں سمیٹ لیا جائے۔ اسلامی فنِ تعمیر کے اُصول بنانے اور انہیں برتنے میں مسلمانوں نے اس ارشاد کو پوری طرح ذہن میں رکھا۔ ظاہر ہے کہ جس مملکت میں سو برس سے بھی کم عرصے میں عراق، شام، مصر، شمالی افریقہ، ایران، ہسپانیہ، افغانستان، ترکستان اور دریائے سندھ تک کا علاقہ شامل ہو گیا ہو، اُسے معاشرت کے کیسے کیسے نئے تقاضوں سے سابقہ نہ پڑا ہو گا۔ اس لیے مسلمانوں کو جہاں جو اچھی چیز ملی وہ انہوں نے حاصل کر لی۔ اسلامی فنِ تعمیر میں بازنطینی، قبطی، یونانی، ایرانی اور بُدھی اثرات ملے جُلے نظر آتے ہیں۔ بازنطینی عمارتوں سے مینار، گوتھک عمارتوں سے ستون، بُدھی اُستوپوں سے گنبدوں کا ہیولا، ایرانی اور چینی ترکستانی علاقوں سے منبت کاری۔ جہاں جو چیز اچھی نظر آئی اور فن کو بھائی مسلمانوں نے اپنا لی۔ اس میں کچھ ردّ و بدل کیا۔ اسے بہتر سے بہتر بنایا، اپنے انداز میں ڈھالا اور اپنے فن کا ایک حصہ بنا لیا۔ یہ بات اسلام کے عالمگیر نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ اسلام جغرافیائی بندھنوں کا قائل نہیں۔ ساری زمین اللہ کی ہے اور مسلمان اس زمین پر اللہ کا نائب ہے۔ اس لیے اسے حق حاصل ہے کہ دُنیا کے چاروں کونوں سے چیزوں کو اکٹھا کرے۔ ان سے خود فائدہ اُٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے دمشق کی مسجد

بنانے کے لیے وادیٔ سندھ کے راج مزدوروں سے کام لینے میں کوئی ہرج نہ سمجھا۔

نظریۂ حیات عبدالرحمٰن بن عمر نے بصرہ میں مسجد بنوائی تو کابل سے عمارت ساز آئے اور جب ایبک اور التمش نے مسجد قوت الاسلام کی تعمیر کرنا چاہی اور یہاں بہت سی عمارتیں بنیں تو معمار ایران اور قسطنطنیہ سے بھی بلائے گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا کوئی خاص مزاج نہیں۔ اسلام کی بنیاد اللہ کے ایک اور سب پر غالب ہونے کے عقیدے پر ہے۔ کوئی نسلی تعصب ہے، نہ کسی خطۂ زمین سے کوئی بیر ہے۔ ذہن اور نظر میں وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ زندگی میں ترتیب ہے، توازن ہے، مساوات ہے۔ یہی رُوح ہے جو الحمرا سے لے کر مشرق کے آخری گوشے تک مسلمانوں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں موجود ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بحیرۂ روم کی ایک جانب مسلمانوں کی تعمیر میں پتھر زیادہ کام میں لایا گیا ہے اور دوسری طرف اینٹ۔ یہ جغرافیائی ضروریات کا نتیجہ ہے۔ فن کے اعتبار سے یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے پتھر اور اینٹ کا ایک ساتھ استعمال شروع کیا۔ مسلمانوں کی فطرت میں تسخیرِ کائنات کا جوہر ہے۔ یہ نظریۂ حیات مسجد نبوی کی سادہ اور معمولی عمارت سے لے کر الحمرا کے پرشکوہ محل تک ہر تعمیری کارنامے میں موجود ہے۔

حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں مدینہ منورہ میں نو مسجدیں بن گئی تھیں۔ ان مسجدوں میں بعض پتھر کی تھیں اور ان پتھروں پر گل بوٹے بنے ہوتے تھے۔

ہجرت کے بعد جب کوئی قبیلہ مسلمان ہوتا تو اپنے لیے ضرور ایک مسجد بنا لیتا۔ عرب کے طول و عرض میں دیکھتے ہی دیکھتے کئی مسجدیں بن گئیں۔ سب سے پہلا جمعہ مسجد بنی سالم بن عوف میں پڑھا گیا۔ یہ اُسی دن کی بات ہے جب آپؐ قُبا سے بنو نجار کے محلے کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔

مسلمانوں نے اپنی ابتدائی فتوحات کے بعد جو پہلی مسجدیں تعمیر کیں وہ کوفہ اور

بصرہ میں بھی۔ یہ دونوں شہر مسلمانوں ہی کے بسائے ہوئے تھے۔ یہ حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا۔ کوفے کی تعمیر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے کی اور بصرے کی عتبہ بن غزوانؓ نے۔ یہاں سے مسلمانوں کی فنی روایات کا ایک اور قدم آگے بڑھتا ہے۔ شام اور عراق عجم پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا تو جو وسائل قبضے میں آئے۔ انہیں بہتر سے بہتر طریقے پر استعمال کیا گیا۔ مسجدِ نبویؐ کی چھت کھجور کے تنوں پر قائم کی گئی تھی، لیکن کوفہ کی مسجد میں حیرا کے قدیم شاہی محل کے نفیس سنگِ مرمر کے ستون استعمال کیے گئے تھے۔ مسجد نبوی کی شرح کی تعمیر کی طرح اس مسجد کا نقشہ چوکور طرز کا تھا۔ صحن کشادہ اور اگلا حصہ چھت والا تھا۔

منبر و مینار کوفہ کی مسجد بنانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مصر فتح ہوا۔ یہاں بھی مسلمانوں نے ایک شہر بسایا۔ اس کا نام فُسطاط رکھا۔ یہاں بھی مسجد بنائی گئی۔ ویسی ہی جیسے مسجدِ نبوی تھی۔ اور پھر مسلمان جہاں پہنچے وہاں مسجدیں تعمیر ہونے لگیں۔ قبرص فتح ہوا تو یہاں مسجد بنی۔ شمالی افریقہ میں حضرت عُقبہ بن نافع نے ابن اثیر کے بیان کے مطابق ۵۵ھ (مطابق ۶۷۴ عیسوی) میں قیروان بسایا تو یہاں جامع بنائی گئی۔

یوں تو مسجدِ نبویؐ میں ایک منبر تھا لیکن دوسری مسجدوں میں منبروں کا بنایا جانا پہلے پہلے مناسب نہ سمجھا جاتا تھا۔ جب حضرت عمرو ابن العاص نے مصر میں مسجد بنائی تو یہاں منبر نصب کروایا۔ یہ منبر نوبیہ کے عیسائی بادشاہ نے بنوا کر تحفے کے طور پر بھیجا تھا۔ اس زمانے سے منبر مسجد کا ایک اہم جزو بن گیا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ منبر مروان بن محمد کے زمانہ میں ۱۳۲ ہجری (۷۴۹ عیسوی) سے بنائے جانے لگے۔
محراب سب سے پہلے مسلمہ بن مخلدؓ نے امیر معاویہ کے زمانے میں بنوایا۔ اس وقت وہ مصر کے والی تھے۔ انہوں نے مسجد عمرو بن عاص کی توسیع کی تو اسلامی دنیا کا پہلا محراب بنایا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ ولید کے دور میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسجدِ نبویؐ کو پھر سے بنوایا تو اس میں محراب بھی بنوائی۔ یہ بھی پہلی مرتبہ مسجد عمروؓ

مصر میں بنایا گیا۔ امیر معاویہؓ نے ایک مینار بنانے کا حکم دیا تھا۔ مسلمہ بن مخلدؓ نے چار مینار بنوائے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ فسطاط کی مسجد میں عمرو بن عاصؓ نے ایک چوکور مینار بنوایا تھا۔ جاء نماز اور چٹائیوں کا پہلے پہل استعمال بھی مسلمہؓ ہی کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے قاہرہ کی مسجدِ عمروؓ، مسجد نبوی کے بعد فنی روایات کے لحاظ سے سب سے اہم مسجد ہے۔

گنبدِ خضرا

مسجد قیروان سے گنبدوں کا رواج شروع ہوا۔ لیکن اُس وقت جب ۵۴ سال بعد ۱۰۵ھ میں پھر سے اُسے تعمیر کیا گیا۔ ورنہ عقبہ بن نافع کی بنائی ہوئی مسجد تو بالکل مسجدِ نبویؐ کے نمونے پر تھی۔

حضرت عمرؓ کے آخری زمانے سے مکے اور مدینے میں بہت سے راج مزدور آ بسے تھے اور نئی نئی عمارتیں بن رہی تھیں۔ کیوں کہ عراق عجم اور شام میں مسلمانوں کی مسلسل فتوحات کی وجہ سے اہلِ مدینہ کی معاشی حالت بہت سُدھر گئی تھی۔ اب بہت سے مسلمان ایسے تھے جنہیں بیت المال سے مستقل وظیفے ملا کرتے تھے۔ اسی لیے حضرت عثمانؓ کے عہد میں مسجدِ نبویؐ کی توسیع کی گئی تو ایرانی سے ساختہ گارے اور مسالے سے بھی کام لیا گیا۔ پتھر تراشے گئے۔ چھت میں لکڑی کے تختے لگائے گئے اور مسجد کی زیب و زینت کا اہتمام کیا گیا۔

بیت المقدس کا وہ حصہ جو قبۃ الصخراء کہلاتا ہے، اسلامی فنِ تعمیر کی قدیم ترین یادگار ہے جو اس وقت بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ مسجدِ قُرطبہ کے ستون دُنیا بھر کی مسجدوں میں سب سے الگ اور نمایاں ہیں۔ انہیں دیکھ کر فوراً عرب کے ریگستانوں میں کھڑے ہوئے کھجوروں کے درختوں کا منظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

خلیفہ ولید نے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں جس میں روضۂ اطہر تھا، سنگِ مرمر کا بنوایا۔ اِس میں ساگوان (اعلیٰ درجہ کی لکڑی) بھی استعمال کی گئی۔ ستونوں میں

لوہا اور سیسہ استعمال کیا گیا۔ پھر انہیں صیقل کر کے ان پر سونے کا پانی چڑھا دیا گیا اس طرح مسجد کی شان و شوکت میں بڑا اضافہ ہوا۔ پونے سات سو سال تک روضۂ مقدسہ پر کوئی قبّہ نہیں تھا۔ پہلے پہل لکڑی کا ایک آٹھ پہلو والا قبّہ بنا کر حجرۂ مبارک کی چھت پر نصب کیا گیا۔ علامہ سمہودی نے لکھا ہے کہ ممالیک بحریہ کے چھٹے فرمانروا منصور بن قلاودن نے یہ قبہ ۶۷۸ھ میں بنوایا تھا۔ مسلمانوں نے اسے ناپسند کیا۔ ۸۸۶ھ میں سلطان اشرف نائت بائی نے پہلا گنبد تعمیر کروایا۔ اس وقت اُس پر کوئی رنگ نہیں کیا گیا۔ بلکہ اُسے سفید ہی رکھا گیا۔ ۹۸۰ھ میں سلطان سلیم ثانی والیٔ قسطنطنیہ نے نیا گنبد بنوایا۔ اس میں رنگین پتھر لگائے گئے۔ ان پر سونے کا کام کیا گیا۔ ۱۲۳۳ھ میں سلطان محمود ثانی والیٔ قسطنطنیہ نے پھر گنبد بنوایا۔ یہ گنبد بھی سفید تھا۔ اور قبّۃ البیضا کہلاتا تھا۔ ۱۲۵۵ھ م ۱۸۳۹ء اس پر سبز رنگ پھیرا گیا اور یہ گنبد خضرا کہلانے لگا۔

مسجد نبویؐ کی تعمیر کے بارے میں ولید بن عبدالملک کا خط ملتے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسجد کی توسیع کے لیے آس پاس کے مکانات حاصل کیے، پھر صالح بن کیسان کو مسجد کے تمام کاموں کی نگرانی سونپ دی۔ آپ کے علاوہ علمائے مدینہ میں حضرت قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، عبیداللہ بن عبداللہ خارجہ بن زید، عبداللہ بن عبداللہ بن عمرؓ جیسے بزرگ پُرانی عمارت کی جگہ نئی عمارت بنانے میں ان کی ہر طرح مدد کرتے رہے۔

اس زمانے میں ولید نے ایک خط قیصرِ رُوم کو لکھا ــــ مطلب تھا ــــ مسجدِ نبوی کی اعلیٰ پیمانے پر تعمیر کا کام شروع ہو رہا ہے تم سے جو سامان ہو سکے بھجواؤ ــــ یہ قیصرِ رُوم کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس سعادت میں حصّہ لینے کا اُسے موقع مل گیا۔ اُس نے فوراً ایک لاکھ مثقال سونا اور چالیس اُونٹوں پر خوب صورت کام کیے ہوئے پتھر اور گل بُوٹے بنانے کا سامان بھیجا ــــ راج مزدوروں کی بھی ایک جماعت بھیجی جس میں علاقۂ شام اور مصر کے کوئی سو آدمی

تھے۔ ولید نے کچھ معمار مدائن سے بھی بلوائے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو شاہانِ کسریٰ کے لیے شاندار عمارتیں بناتے تھے۔

ولید کے حکم سے جو تعمیر ہو رہی تھی وہ حضرت عثمانؓ کی توسیع مسجد کے کوئی ۵۰ یا ۶۰ سال بعد کی بات ہے۔ اس مرتبہ پھر پوری مسجد کو ڈھا کر نئے سرے سے بنایا گیا۔ ساتھ ہی اسے کشادہ کر دیا گیا۔ مغرب میں دو کم تین بُرجوں اور مشرق میں تین ستونوں کی جگہ کا اضافہ ہوا۔ صحنِ مسجد میں چودہ چودہ ستونوں کی چار صفیں بنائی گئیں۔ پوری عمارت پتھر کی تھی۔ بنیادوں میں پتھر اور لوہے سے کام لیا گیا۔

مسجد کے بنانے کے لیے کچھ معمار باہر سے آئے مگر معماروں میں بڑی تعداد اُن کی تھی جو حضرت عمرؓ کے آخری زمانے میں مدینہ آکر بس گئے تھے اور یہاں نئی نئی عمارتیں بنا رہے تھے۔

حسن کاری ولید کے دَور میں ملک میں کوئی فتنہ اور فساد نہ تھا اور فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔ اِس لیے مسجد نبویؐ کی بہتر سے بہتر تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا۔ ایک ایک جھاڑ کے بنانے اور سنوارنے کا اہتمام کیا گیا۔ ایسی عمدہ مینا کاری کی گئی کہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ صرف ایک طرف کی دیوار پر جو قبلہ رُخ تھی، پینتالیس ہزار اشرفی خرچ آیا۔ مسجد میں ایک فوارہ بنایا گیا۔ معماروں کو دل کھول کر اُجرت دی گئی۔ بہتر سے بہتر کام کرنے کے لیے انہیں بڑے بڑے انعام دیے گئے۔ فرش اور دیواروں میں فسیفسا (ٹائلز) لگائے گئے۔

ویسے حضورؐ اکرم کی زندگی ہی میں مدینہ منورہ میں جو مسجدیں بننے لگی تھیں، ان میں سے بعض میں خوب صورت کام کیے ہوئے پتھر لگائے گئے تھے، لیکن مسجد نبویؐ حضرت عثمانؓ کے عہد تک اپنی اصلی اور سادہ حالت ہی میں رہی۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں مسجدِ نبویؐ کی جو تعمیر ہوئی اس میں بھی زیب و زینت کا کچھ بہت زیادہ اہتمام نہ ہو سکا۔ ولید کے سامنے اپنے باپ کی مسجد اقصیٰ کے

گنبدِ صخرا کی مثال تھی اس لیے اُس نے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر میں زیب و زینت کا ہر ممکن خیال رکھا۔ اور جب بعد میں اس نے دمشق کی مسجد کبیر بنوائی تو اس کا یہ شوقِ اہتمام اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ کوئی تین سال کی مدت میں مسجدِ نبویؐ کی تعمیر مکمل ہوئی۔

۹۱ ہجری (۱۰-۷۰۹ عیسوی) کے دن تھے کہ ولید مدینہ آیا کہ خود ہر چیز کو دیکھ سکے، مسجد میں گھوم پھر کر وہ تفصیل سے ایک ایک چیز دیکھتا اور خوشی کا اظہار کرتا۔ فوارہ اُسے بہت پسند آیا، بولا ___ جو لوگ مسجد میں آئیں وہ اس پانی کو استعمال کر سکتے ہیں۔

وہ اپنے ساتھ بہت سی انگیٹھیاں اور خوشبو کے مسالے لے آیا تھا۔ مسجد میں ان کا استعمال شروع ہوا۔ نگرانی کے لیے خدام مقرر کیے گئے اور مسجد کے تکمیل پا جانے کی خوشی میں بہت سا روپیہ اور سونے چاندی کے برتن خیرات ہوئے۔

مردِ قلندر حضرت سعید بن مسیّب بڑے عالم اور بڑے بزرگ تھے۔ مدینے میں ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا۔ آپ ہی تھے جنہوں نے ولید کی ولی عہدی کے لیے بیعت کرنے سے انکار فرما دیا تھا۔ ہشام بن عبدالملک نے آپ پر بڑی زبردستی کی تھی۔ کوڑے پٹوائے گئے۔ قید کیا گیا۔ لیکن آپ نے مان کر ہی نہ دیا۔ عبدالملک کو معلوم ہوا کہ حضرت سعید بن مسیّب جیسے عالمِ دین پر بیعت کے لیے یہ کچھ گذری تو وہ ہشام پر سخت ناراض ہوئے تھے اور اس نے اُن سے معافی مانگ لی تھی۔

مسجدِ نبویؐ میں ہر روز کچھ وقت گزارنا ان کا معمول تھا۔ اتفاق دیکھیے کہ جب ولید مسجد میں داخل ہوا تو وہ اپنی جگہ عبادت میں مصروف تھے۔ ولید کے آنے سے پہلے مسجد میں جتنے لوگ تھے انہیں نکال دیا گیا۔ لیکن سپاہیوں کو جرات نہ ہوئی کہ حضرت سعید بن مسیّب سے کچھ کہہ سکیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز چاہتے تھے کہ ولید اِدھر اُدھر مسجد دیکھتا رہے اور اس کی نظر حضرت سعید بن مسیّب پر نہ پڑے۔ ورنہ نہ جانے کیا مصیبت کھڑی ہو جائے۔ اتنے میں ایک شخص آپ کے پاس پہنچا ___ بولا ___ آپ کو معلوم ہے کہ امیرالمومنین ولید بن عبدالملک مسجد دیکھنے

آئے ہوئے ہیں۔

آپ نے فرمایا — ہاں!

اُس شخص نے درخواست کی وہ وہاں سے چلے جائیں تو بہتر ہے۔ جواب ملا — جو میرے اُٹھنے کا وقت ہے اس سے پہلے تو میں یہاں سے نہ جاؤں گا۔

اُس شخص نے کہا — اچھا تو پھر چلیے امیر المومنین کو سلام کر لیجیے!

دو ٹوک جواب ملا — میں خود اُٹھ کر ان کے سلام کو جانے کا نہیں — وہ آ جائیں تو اور بات ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی کوششیں کام نہ آئیں اور گھومنے پھرتے میں ولید کی نظر ان کی طرف اُٹھ ہی گئی — پوچھا — یہ کون بیٹھے ہیں؟ — سعید بن مسیب تو نہیں!

جواب دیا گیا — ہاں وہی ہیں! آنکھوں سے کم دکھائی دیتا ہے اور غالباً انہیں یہ معلوم نہیں کہ آپ یہاں ہیں۔ ورنہ ضرور سلام کو حاضر ہوتے۔ بات بنانے کی کوشش کی گئی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ولید نے کہا — اچھا ہم خود ان کے پاس جائیں گے اور سلام کریں گے۔ قریب آ کر مزاج پرسی کی۔

درویشِ خدا مست اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ سلام کا جواب سلام سے دیا۔ خیریت کے جواب میں خیریت پوچھی پھر ایک نہ دو! ولید آگے بڑھ گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز دم سادھے ساتھ تھے۔ ولید نے کہا — پرہیزگار بزرگوں کا یہی ایک نمونہ باقی رہ گئے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اطمینان کا سانس لیا۔ جواب دیا — آپ بالکل سچ کہتے ہیں۔

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اسلامی قانون سازی کا اہم ترین مسئلہ

جناب محمد امین صاحب۔ ریاض، سعودی عرب

(۲)

اب ہم اس امر پر غور کریں گے کہ یہ ادارہ کیسا ہونا چاہیے اور اسے کیسے وجود میں لایا جائے؟

اُوپر کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لیے کسی مشاورتی ادارے کا قیام سُود مند نہیں کیونکہ اصحابِ اقتدار اسے کوئی وزن نہیں دیں گے اور موجودہ ہیئت کی اسمبلی (خواہ اس کا نام مجلس شوریٰ ہی رکھ دیا جائے ــــ اور صرف نام بدلنے سے فرق ہی کیا پڑتا ہے اگر اس کی حقیقت نہ بدلے بلکہ الٹا اسلامی مصطلحات بدنام ہوں گی) یا اسمبلیاں اس کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں اور نہ اس چیز کا امکان نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں علماء اور اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ ان اسمبلیوں میں اتنی کثرت سے آجائیں گے کہ وہ قانون سازی کو اسلامی رُخ دے سکیں گے، تو پھر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ نظری طور پر اس کا سیدھا سادھا حل یہ ہے کہ قومی اسمبلی کا انتخاب اس طرح کروایا جائے کہ اس میں علماء اور اسلامی سکالرز کی ایک معقول تعداد پہنچے اور پھر اسمبلی میں ان پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی جائے اور قانون سازی کے متعلق سارا اختیار اس کو دے دیا جائے۔ کیونکہ یہ لوگ منتخب ہوں گے لہٰذا ان کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج نہ کیا جا سکے گا اور چونکہ وہ اہلِ علم میں سے ہوں گے

لہٰذا ان کے فیصلوں پر لوگوں کو اعتماد بھی ہوگا۔

جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ اس کمیٹی کو اتنا با اختیار کیوں بنایا جائے اور یہ جمہوری سپرٹ کے خلاف ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً یہ مغربی جمہوریت کے مطابق نہیں ہے لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے، اور آخر ہم پر کس نے فرض کیا ہے کہ مغربی جمہوریت کی اندھی تقلید کریں، ہم تو صرف اس چیز کے مکلف ہیں کہ اسلامی شریعت کا اتباع کریں اور جن چیزوں میں شریعت نے صریح حکم نہ دیا ہو وہاں وہ راستہ اختیار کریں جو شریعت کے احکام کے مطابق اور اس کے مزاج کے قریب تر ہو اور جو اس کے مقاصد کو پورا کرتا ہو، نہ کہ اندھا دھند غیر اسلامی افکار اور اداروں کی پیروی کریں۔ آپ اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھیے اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں جو شوریٰ تھی اس کا جائزہ لیجیے۔ وہاں شوریٰ دو بڑے حلقوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس میں جہاں ایک طرف قبیلوں کے سربراہان اور علاقوں کے معززین ہوتے تھے وہیں ان میں ایک جماعت علومِ قرآن و حدیث اور فقہ کے ماہر صحابہؓ پر مشتمل ہوتی تھی۔ عام امور سلطنت میں ساری شوریٰ سے مشورہ کیا جاتا تھا، لیکن دقیق فنی مسائل میں انہی ماہرین اور متخصصین سے رائے لی جاتی تھی اور انہی کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا جاتا تھا[۱]۔ خلافتِ راشدہ کے عہد سے اس کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں مثلاً قضیہ ارضِ سواد یا خراجی زمینوں اور طاعون عمواس کا مسئلہ وغیرہ۔ تو خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی کی آج یہی صورت ہے کہ شوریٰ میں معززین اور دوسرے طبقوں کے نمائندوں کے علاوہ علماء اور سکالرز بھی ہوں عام امورِ سلطنت میں ساری شوریٰ فیصلہ کرے لیکن جہاں قانونی اور فقہی مسائل

---

[۱] شیخ ذکریا البری، مبدأ الحریة فی الاسلام، مجلہ، عالم الفکر، الکویت، شمارہ جنوری، مارچ ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۳۱

[۲] ڈاکٹر محمد یعقوب الطیبی، مبدأ الشوریٰ فی الاسلام، صفحہ ۲۴۳، طبع الاسکندریہ۔

ہیں وہاں ان کا فیصلہ ایک ایسی جماعت کرے جس میں صرف یہ فقہا اور اسلامی قانون کے ماہرین ہوں۔

پھر یہاں یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ فقہاء اور اصولیوں کا یہ صدیوں سے متفقہ فیصلہ ہے اور اس پر ان کا اجماع ہے اور اس میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہے کہ جتنے شرعی یعنی فقہی مسائل میں حکم شرعی کے ادراک کا حق عام آدمی کو نہیں بلکہ صرف مجتہدین کو ہے۔ اور مجتہد کی صفات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ اُسے قرآن وسنت فقہ اور عربی زبان کا انتہائی ماہر ہونا چاہیے۔ اب یہ شرائط شوریٰ یا قومی اسمبلی کے سارے ممبران میں نہیں پائی جاسکتیں، نیز ہمارے زمانے میں چونکہ ان شرائط کے ممکنہ حد تک پائے جانے کا امکان (اور ہم استطاعت کی حد تک ہی مکلف ہیں نہ کہ امر مثالی کے)، صرف جید علماء اور اسلامی سکالرز ہی میں ہے۔ لہٰذا اس شرعی اصول کا تقاضا بھی یہی ہے کہ درپیش اجتہادی مسائل کو عام شوریٰ پر نہ چھوڑا جائے بلکہ شوریٰ ہی میں سے فقہا اور اسلامی سکالرز کی ایک جماعت کے یہ کام سپرد کر دیا جائے۔

یہ ایک علمی جواب تھا اس اعتراض کا کہ شوریٰ یا اسمبلی میں اس قسم کی کمیٹی کو

۱؎ اس سلسلے میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ "ایک عام آدمی اجتہاد نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اس کام کے لیے اسی طرح نااہل ہے جس طرح نابالغ بچہ اور فاترالعقل آدمی (المستصفیٰ للغزالی، جلد ۱ ص ۱۸۲، طبع دارالمصادر) اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں "اجتہاد کی اہلیت نہ رکھنے والا اگر اجتہاد کرے تو اُس کی حیثیت اس اندھے کی سی ہے جو خود بھی اپنا رستہ نہیں دیکھ سکتا (دوسروں کو کیا دکھائے گا) اس کے باوجود اگر وہ اجتہاد کرے تو گناہ گار ہوگا، حکومت کو چاہیے کہ زبردستی اسے اجتہاد سے روک دے — کیونکہ اس طرح نہ صرف وہ اپنی بلکہ دوسروں کی گمراہی کا بھی سامان کرے گا (الرسالہ للشافعی صفحہ ۵۰۹ طبع دارالتراث، القاہرہ)۔

بااختیار کیوں بنایا جائے۔ اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ایسے مناسب لوگوں کا انتخاب کیسے ہو اور وہ کمیٹی کیسے بنے تو اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ الیکشن جماعتی بنیادوں پر ہوں اور متناسب نمائندگی کے تحت ہوں سیاسی جماعتوں کو بتا دیا جائے کہ ان کے نمائندوں کی فہرست میں علماء اور اسلامی سکالرز کے نام ہونے چاہئیں، پھر اسمبلی میں جتنی ہوئی سیٹوں کے تناسب سے ان سیاسی جماعتوں کے نمائندوں میں سے علماء اور سکالرز پر مشتمل ایک خودمختار کمیٹی بنا دی جائے اور اسمبلی میں ابتدائی بحث کے بعد ہر مسودۂ قانون اس کمیٹی کو بھجوا دیا جائے جس کا فیصلہ آخری ہو، البتہ صدرِ مملکت یا اسمبلی نظرِ ثانی کے لیے اسے مسودۂ قانون واپس بھجوا سکیں لیکن اسے رد نہ کر سکیں۔ کمیٹی کو یہ اختیار بھی ہونا چاہیے کہ وہ نئے مسودہ ہائے قوانین کے علاوہ پہلے سے بنے ہوئے قوانین میں سے غیر اسلامی اجزا نکال کر اُسے نئی صورت دے سکیں۔ سپریم کورٹ کو یہ اختیار دیا جا سکتا ہے کہ اس کمیٹی کے پاس شدہ کسی قانون کو خلافِ اسلام ہونے کی بنا پر کالعدم قرار دے سکے بشرطیکہ اس کے جج اسلامی قوانین کے ماہرین میں سے ہوں۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر الیکشن غیر جماعتی ہوں تو جو علماء اور اسلامی سکالرز بھی ایوانِ زیریں میں پہنچیں اُن پر مشتمل یہ خودمختار کمیٹی بنا دی جائے اِسی طرح کی ایک کمیٹی ایوانِ بالا میں بھی بنا دی جائے، اختلافِ رائے کی صورت میں دونوں کمیٹیوں کے مشترکہ اجلاس میں کثرتِ رائے سے فیصلہ کر لیا جائے۔ اِس وقت جو لوگ یا جس طرح کے لوگ اسلامی نظریاتی کونسل میں ہیں، ان کو صدرِ مملکت ایوانِ بالا میں نامزد کر سکتے ہیں۔ اگر ایوانِ زیریں میں اتنے مناسب آدمی نہ ہوں تو شروع ہی سے ایک ایسی کمیٹی بنائی جا سکتی ہے جس میں دونوں ایوانوں سے ارکان لے کر یہ قانونی کمیٹی یا اجتہاد کمیٹی تشکیل دی جائے، لیکن اِس صورت میں کمیٹی کے غالب ارکان کا منتخب شدہ ہونا ضروری ہے اور چیئرمین

بھی انہی میں سے ہونا چاہیے۔

تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر ایوانِ زیریں میں خاطر خواہ تعداد میں علماء و اسلامی سکالرز نہ پہنچیں یا ایسے لوگ عام انتخابات کے جھمیلوں میں نہ پڑنا چاہیں یا ایوانِ بالا میں نامزدگی کا طریقہ بعض لوگوں کے نزدیک غیر پسندیدہ ہو تو متبادل صورت یہ اختیار کی جا سکتی ہے کہ ایسے لوگوں کا انتخاب، ایوانِ زیریں اور ایوانِ بالا کے مشترکہ اجلاس میں کر لیا جائے۔

اس طرح کے انتظامات سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جو لوگ منتخب ہوں وہ با اختیار بھی ہوں اور اہلِ علم بھی۔ وہ اسلامی قانون سازی کے سلسلے میں ایسا کام کر پائیں گے جو مشاورتی ادارے یا عام اسمبلیاں نہیں کر سکتیں۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

اسلامی تنظیم کی اہمیّت اور اس کے تقاضے

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

برادرم اسعد گیلانی نے اس مضمون میں اسلامی تنظیم کے متعلق ایسے اہم اقتباسات جمع کر دیئے ہیں کہ اس تحریر کے آئینے میں ہم اپنے چہروں کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ یہ مضمون بتاتا ہے کہ ہم کن سمجھوتوں کو لے کر سفر تحریک پر نکلے ہیں اور اب کن کن پہلوؤں سے کہاں کیا کیا کمی محسوس ہوتی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ سطور ہمارے لیے خود احتسابی اور کردار کی تعمیرِ نَو کا ذریعہ بنیں گی۔ (ف۔ ر۔ ص)

اسلامی تحریک تنظیم[1] کے بغیر کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی اور تنظیم اپنے مخصوص تقاضے رکھتی ہے جنہیں اگر پورا نہ کیا جائے تو تنظیم اپنے نتائج دکھانے سے قاصر رہتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ تحریک اسلامی سے وابستہ لوگ تنظیم کی اہمیت سے بھی آگاہ ہوں اور اس کے تقاضوں کو بھی جانتے ہوں۔

---

[1] میں نے یہ مضمون مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تصانیف اور اُن کی جماعت کی رودادوں سے مرتب کیا ہے تاکہ دعوتِ دین کا حقیقی مقصد اسلامی تحریک کا قیام اور نظامِ اسلامی کا نفاذ سامنے آسکے۔ (اسعد گیلانی)

میں نے اس مضمون میں اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ تحریک اسلامی کی تنظیم، اس کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو براہ راست اس کے لٹریچر سے پیش کیا جائے خصوصاً تحریک کے بانی نے جو نقوش راہ متعین کیے ہیں اُن کو اجاگر کیا جائے اور جو ہدایات انہوں نے دی ہیں ان سے آگاہی حاصل کی جائے اس لیے کہ کسی تنظیم کا بانی ہی اس کی اہمیت کو بیان کرنے اور اس کے تقاضوں سے دوسروں کو آگاہ کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ بانی جماعت اپنی دعوتی تقریر شہادتِ حق کے صفحہ ۲۵ تا ۳۷ میں اقامتِ دین کے لیے تنظیم کے بارے میں فرماتے ہیں۔

تنظیم اقامتِ دین

پورے دین کو قائم کرنے اور اس کی صحیح شہادت ادا کرنے کے لیے قطعاً ناگزیر ہے کہ تمام ایسے لوگ جو مسلمان ہونے کی شعور اور انہیں ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، متحد ہو جائیں اور منظم طریقے سے دین کو عملاً قائم کرنے اور دنیا کو اس کی طرف دعوت دینے کی کوشش کریں اور ان مزاحمتوں کو راستے سے ہٹائیں جو اقامتِ دین و دعوتِ دین کی راہ میں حائل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں جماعت کو لازم قرار دیا گیا ہے اور اقامتِ دین اور دعوتِ دین کی جدوجہد کے لیے ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک منظم جماعت ہو، پھر خدا کی راہ میں سعی و جدوجہد کی جائے اور یہی وجہ ہے کہ جماعت کے بغیر زندگی کو جاہلیت کی زندگی اور جماعت سے علیحدہ ہو کر رہنے کو اسلام سے علیحدگی کا ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس بات کو بھی سمجھ لیتے ہیں اور اس فہم سے ان کے اندر مسلمان ہونے کی ذمہ داری کا احساس اس حد تک قوی ہو جاتا ہے کہ اپنے دین کی خاطر اپنی انفرادیت اور خود پرستی کو قربان کر کے جماعتی نظم کی پابندی قبول کرلیں ان سے ہم کہتے ہیں کہ اب تمہارے سامنے تین راستے ہیں اور تمہیں آزادی ہے کہ ان میں سے جس کو چاہو اختیار کرو۔ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ ہماری دعوت، عقیدہ، نصب العین، نظامِ جماعت اور طریق کار سب کچھ خالص اسلامی ہے اور ہم وہی کام کرنے اٹھے ہیں جو قرآن و حدیث کی رو سے اُمتِ مسلمہ کا اصل کام ہے تو ہمارے ساتھ آجاؤ۔ اگر کسی وجہ سے تمہیں ہم پر اطمینان نہ ہو اور کوئی دوسری جماعت تم کو ایسی نظر آتی ہو جو خالص اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریق پر کام کر رہی ہو تو اس میں شامل ہو جاؤ، ہم خود بھی ایسی جماعت پاتے

تو اسی میں شامل ہو جاتے کیونکہ ہمیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چُننے کا شوق نہیں ہے اور اگر تم کو نہ ہم پر اطمینان ہے نہ کسی دوسری جماعت پر تو پھر تمہیں اپنے فرضِ اسلامی کو ادا کرنے کے لیے خود اُٹھنا چاہیے اور اسلامی طریق پر ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جس کا مقصد پورے دین کو قائم کرنا اور قول و عمل سے اس کی شہادت دینا ہو۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی تم اختیار کرو گے ان شاء اللہ حق پر ہو گے۔"

جماعتی زندگی رسائل و مسائل جلد اوّل کے صفحہ ۵۰۰ پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بانیٔ جماعت نے جماعتی زندگی کے بارے میں فرمایا ہے کہ صحیح اسلامی زندگی جماعت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

"ہمارے علم میں اسلامیت کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ اگر آدمی کو اپنے گردو پیش ایسی کوئی جماعت نظر نہ آتی ہو جو اسلام کے اجتماعی نصب العین کے لیے اسلامی طریقہ پر سعی کرنے والی ہو تو اُسے سچے دل سے ایسی جماعت کے وجود میں لانے کی سعی کرنی چاہیے لیکن جب ہمیں اس کوشش میں پوری ناکامی ہوئی تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ان لوگوں کو جمع کریں جو موجودہ جماعتوں کے طرزِ عمل سے غیر مطمئن اور صحیح اسلامی اُصول پر کام کرنے کے خواہشمند ہیں۔ چنانچہ شعبان ۱۳۶۰ھ و اگست ۱۹۴۱ء میں ہم نے ان لوگوں کا اجتماع منعقد کیا اور باہمی مشورہ سے جماعت قائم کی۔"

تحریکِ اسلامی میں داخلہ کے لیے جس بات کا اطمینان حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے اس کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے ۱۵ اپریل ۱۹۵۱ء کو مجلس شوریٰ کی روداد کے مطابق فرمایا۔

داخلہ جماعت کسی شخص کو بھی جماعت میں اس وقت داخل نہ کیا جائے جب تک اس کے متعلق یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ۔

"وہ جماعت کا پورا لٹریچر نہیں تو اس کا بیشتر اور ضروری حصہ اچھی طرح مطالعہ کر کے اس کی رُوح جذب کر چکا ہے اور اس کے ذہن میں جماعت کے مقصد اور طریق کار دونوں کے بارے میں کوئی اُلجھن یا خلش باقی نہیں رہ گئی ہے۔"

"وہ جماعت اسلامی کی دینی و اخلاقی حیثیت، اس کی دعوت اور کارکنوں سے اس کے کم از کم مطالبات کو پوری طرح سمجھ چکا ہے"۔

"اس نے جماعت کے ساتھ عملاً کام کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ذہناً یک سو، مستعد، اخلاقاً قابلِ اعتماد اور اپنے عزم میں پختہ ہے"۔

انہوں نے جماعت میں داخلہ کے لیے مزید وضاحت کرتے ہوئے شہادتِ حق کی تقریر کے صفحہ ۲۹ پر فرمایا۔

"اپنے ارکان سے ہمارا کوئی مطالبہ اس مطالبے کے سوا نہیں ہے جو اسلام نے ہر مسلمان سے کیا ہے۔ ہم نہ تو اسلام کے اصل مطالبے پر ذرہ برابر کسی چیز کا اضافہ کرتے ہیں اور نہ اس میں سے کوئی چیز گھٹاتے ہیں۔ ہم ہر شخص کے سامنے پورے اسلام کو بے کم و کاست پیش کر دیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ اس دین کو جان بوجھ کر شعور کے ساتھ قبول کرو۔ اس کے تقاضوں کو سمجھ کر ٹھیک ٹھیک ادا کرو۔ اپنے خیالات اور اقوال اور اعمال میں سے ہر اس چیز کو خارج کر دو جو دین کے احکام اور اس کی روح کے خلاف ہو۔ اور اپنی پوری زندگی سے اسلام کی شہادت دو۔ بس یہی ہمارا قاعدۂ رکنیت ہے"۔

رکنیت کی ذمہ داریاں

پھر رکنیت کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رودادِ جماعت اسلامی حصہ دوم کے صفحہ ۱۱، ۱۲ پر کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"بہت سے لوگ اس جماعت کی رکنیت اور عام انجمنوں اور پارٹیوں کی رکنیت کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ وہ ابھی تک اس گمان میں ہیں کہ یہ بھی کوئی انجمن ہے جس میں کسی ادنیٰ وجہ کشش کی بنا پر شامل ہو جانا اور شامل ہو کر دلچسپی نہ لینا، اور پھر کسی چھوٹی یا بڑی وجہ ناپسندیدگی کی بنا پر الگ ہو جانا آدمی کے دین و ایمان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت اس جماعت کی نوعیت عام انجمنوں کی نوعیت سے بالکل مختلف ہے۔ یہ جماعت دینِ حق کی اقامت کے لیے قائم ہوئی ہے۔ اس کا نصب العین وہی ہے جو قرآن کی رو سے اسلام کا حقیقی نصب العین ہے۔ اس کے پیش نظر وہی کام ہے جس کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ اس میں داخل ہوتے وقت ہر شخص سے پورے شعور کے ساتھ وہ عہد لیا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ

نے اپنی کتاب میں معاملہ بیع سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ایسی جماعت میں داخل ہونے کا جو شخص ارادہ کرے اُسے پہلے اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ آیا فی الحقیقت اس کی یہی غرض اور یہی نوعیت اور یہی کام اس کے پیش نظر ہے۔ اگر تحقیق سے اس کو ان اُمور پر اطمینان حاصل نہ ہو تو سرے سے جماعت کی شرکت ہی غلط ہے۔ لیکن اگر اسے اطمینان حاصل ہو جائے اور وہ یہ یقین رکھتے ہوئے داخلِ جماعت ہو کہ اس جماعت کی غرض و غایت یہی ہے جو دستور میں بیان کی گئی ہے اور اس یقین کی بنا پر وہ اللہ سے خوب سوچ سمجھ کر بیع کا معاہدہ کرے تو اس کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی شرکت اور ایسے معاملہ بیع کی یہ حیثیت ہرگز نہیں ہو سکتی کہ ایک کوٹ ہے جسے جب چاہا پہنا اور جب چاہا اُتار دیا۔ ادھر قدم بڑھانے سے پہلے اپنی واپسی کی کشتیاں جلا دیجیے۔ یہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھیے کہ اب پلٹ کر جانے کے لیے کوئی جگہ آپ کے لیے نہیں ہے۔ خدا سے عہد باندھنے کے بعد جس جان و مال کو آپ بیچ چکے ہیں اُسے اب واپس نہیں لے سکتے۔ اس معاہدہ کے ساتھ ہی آپ سر دھڑ کی بازی لگا چکے ہیں اب آپ کو جان لڑا کر یہ کام کرنا ہے۔ خود اس راہ پر چلنا ہے اور دوسروں کو چلانا ہے۔ کوئی خرابی رُونما ہوتی نظر آئے تو بھاگنے کی فکر نہ کیجیے۔ بلکہ کم از کم اسی جذبے کے ساتھ اُسے دُور کرنے کی فکر کیجیے جس طرح آپ کے گھر میں آگ لگ جائے تو اُسے بجھانے کی فکر کریں گے۔ آگے والا اگر نہ چلے تو پیچھے سے سرک نہ جائیے بلکہ یا تو اُسے چلنے پر مجبور کیجیے یا اُسے ہٹا کر پھینک دیجیے، خود آگے بڑھیے یہاں اگر آپ اس کام میں دلچسپی نہ لیں گے یا وقت، مال، محنت، دل و دماغ اور جسم و جان کی قوتیں صرف کرنے سے جی چرائیں گے یا دوسرے کاموں کو اس پر مقدم رکھیں گے تو اپنے خدا سے بے وفائی کریں گے۔ آپ کا عہد کسی انسان سے نہیں خدا سے ہے۔ شرکت کے وقت جو آپ نے عہد کیا ہے اس کے ساتھ ہی آپ اپنا سب کچھ اور خود اپنے آپ کو خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہیں۔ اب آپ کی ہر چیز پر پہلا اور مقدم حق خدا اور اس کے کام کا ہے باقی تمام چیزیں اس سے مؤخر ہیں۔

پھر روداد حصہ اوّل کے صفحہ ۷۰،۸ پر اجتماع اوّل میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"محض دماغی طور پر کسی شخص کا اس تحریک کو سمجھ لینا اور اس پر صرف عقلاً مطمئن ہو جانا تو اس راہ کا محض ابتدائی قدم ہے۔ اس تاثر سے کام نہیں چلتا۔ یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ دل میں ایک آگ بھڑک اٹھے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آگ تو شعلہ زن ہونی چاہیے جتنی اپنے بچے کو بیمار دیکھ کر ہو جاتی ہے اور آپ کو کھینچ کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے۔ یا اتنی جتنی گھر میں غلّہ نہ پا کر بھڑکتی ہے اور آدمی کو تگ و دو پر مجبور کر دیتی ہے اور چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ سینوں میں وہ جذبہ ہونا چاہیے جو ہر وقت آپ کو اپنے نصب العین کی دھن میں لگائے رکھے۔ دل و دماغ کو یکسو کر دے اور توجہات کو اس کام پر ایسا مرکوز کر دے کہ اگر ذاتی یا خانگی یا دوسرے غیر متعلق معاملات کبھی آپ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں بھی تو آپ سخت ناگواری کے ساتھ ان کی طرف کھنچیں۔ کوشش کیجیے کہ اپنی ذات کے لیے آپ قوت اور وقت کا کم سے کم حصہ صرف کریں۔ اور آپ کی زیادہ سے زیادہ جدوجہد اپنے مقصدِ حیات کے لیے ہو۔ جب تک یہ دل کی لگن نہ ہو گی اور آپ ہمہ تن اپنے آپ کو اس کام میں جھونک نہ دیں گے، محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہ بنے گا۔"

"جماعت کے ارکان کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک بہت بڑا دعویٰ لے کر بہت بڑے کام کے لیے اٹھ رہے ہیں۔ ان کی سیرتیں اگر ان کے دعوے کی نسبت سے اس قدر پست ہوں کہ نمایاں طور پر ان کی پستی محسوس ہوتی ہو تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے دعوے کو مضحکہ بنا کر رکھ دیں گے اس لیے ہر شخص کو چاہیے جو اس جماعت میں داخل ہو، اپنی دُہری ذمہ داری محسوس کرے، خدا کے سامنے تو وہ بہر حال ذمہ دار ہے، مگر خلقِ خدا کے سامنے بھی اس کی ذمہ داری بہت سخت ہے۔ جس بستی میں آپ لوگ موجود ہوں وہاں عام آبادی سے آپ کے اخلاق بلند تر ہونے چاہئیں، بلکہ آپ کو بلندیٔ اخلاق، پاکیزگیٔ سیرت اور دیانت و امانت میں ضرب المثل بن جانا چاہیے۔ آپ کی ایک معمولی لغزش نہ صرف جماعت کے دامن پر بلکہ اسلام کے دامن پر دھبہ لائے گی اور بہت سے لوگوں کے لیے سبب گمراہی بن جائے گی۔

تنظیم کی جان

بانیٔ جماعت تنقیحات کے صفحہ ۲۵۵ پر فرماتے ہیں۔ "اطاعت اور ایمان

تنظیم کی جان ہیں۔ ایمان جس قدر راسخ ہوگا اور اطاعت حقیقی کامل ہوگی، تنظیم اتنا ہی مضبوط اور طاقت ور ہوگا اور وہ اپنے مقاصد تک پہنچنے میں اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔ بخلاف اس کے ایمان میں جتنا ضعف اور اطاعت سے جتنا انحراف ہوگا اسی قدر تنظیم کمزور ہوگا اور اسی نسبت سے وہ اپنے مقاصد تک پہنچنے میں ناکام رہے گا۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی جماعت میں نفاق، بدعقیدگی، انتشارِ خیال، خود سری، نافرمانی اور بے ضابطگی کے امراض پھیل جائیں اور پھر بھی اس میں نظم باقی رہے اور وہ کسی شعبہ حیات میں ترقی کی طرف رواں دواں نظر آئے۔ یہ دونوں حالتیں ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ دنیا جب سے آباد ہوئی ہے اُس وقت سے آج تک ان دونوں کا کبھی اجتماع نہیں ہوا اور اگر قانونِ فطرت اٹل ہے تو اس قانون کی یہ دفعہ بھی اٹل ہے کہ دونوں حالتیں کبھی یک جا جمع نہیں ہوسکتیں"۔

پھر رودادِ مجلس شوریٰ ۱۹ اپریل ۱۹۵۱ء کے صفحہ ۴۶ پر لکھا گیا ہے:

"اقامتِ دین کی سعی کرنے والی ایک جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا ایک جز ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کی خاطر جس نے کسی کو اپنا امیر مانا ہے وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے۔ جس قدر اللہ اور اس کے دین سے آدمی کا تعلق زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ سمع و طاعت میں بڑھا ہوا ہوگا اور جتنی اس تعلق میں کمی ہوگی اتنی ہی سمع و طاعت میں بھی کمی ہوگی۔ اس سے بڑی قابلِ قدر قربانی اور کیا ہوسکتی ہے کہ جس شخص کا آپ پر کوئی زور نہیں ہے اور جسے محض خدا کے کام کے لیے آپ نے امیر مانا ہے اس کا حکم ایک وفادار ماتحت کی طرح مانیں اور اپنی خواہش اور پسند اور مفاد کے خلاف اس کے ناگوار احکام تک کی بسر وچشم تعمیل کرتے چلے جائیں۔ یہ قربانی چونکہ اللہ کے لیے ہے اس لیے اس کا اجر بھی اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اس کام میں شریک ہونے کے بعد کسی حال میں چھوٹا بننے پر راضی نہ ہو اور اطاعت کو اپنے مرتبے سے گری ہوئی چیز سمجھے یا حکم کی چوٹ اپنے نفس کی گہرائیوں میں محسوس کرے اور تلخی کے ساتھ اس پر تلملائے، یا اپنی خواہش اور مفاد کے خلاف احکام کو ماننے میں ہچکچائے وہ دراصل اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ابھی اس کے نفس نے اللہ کے آگے پوری طرح سرِ اطاعت خم نہیں کیا ہے اور ابھی اس کی انانیت اپنے دعووں سے دستبردار نہیں ہوئی ہے۔

مناصب پر فائز حضرات کی ذمہ داری اس کے بعد بانی جماعت نے اپنی تقریر "ہدایات" کے صفحہ ۲۶ پر ذمہ داران جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

"میں امرائے جماعت کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ حکم چلانے کا صحیح طریقہ سیکھیں۔ جس شخص کو بھی نظمِ جماعت کے اندر کسی ذمہ داری کا منصب سونپا جائے اور کچھ لوگ اس کے تحتِ امر دیے جائیں اس کے لیے یہ ہرگز حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھنے لگے اور اپنے تابع رفقاء پر بے جا حکم جتانے لگے۔ اُسے حکم چلانے میں کبریائی کی لذت نہ لینی چاہیے، اُسے اپنے رفقاء سے نرمی اور ملائمت کے ساتھ کام لینا چاہیے۔ اسے اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں کسی کارکن میں عدمِ اطاعت اور خودسری کا جذبہ اُبھار دینے کی ذمہ داری خود اُس کے اپنے کسی غلط طریق کار پر عائد نہ ہو جائے۔ اسے جوان اور بوڑھے، کمزور اور طاقت ور، [illegible] اور خستہ حال سب کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکنا چاہیے۔ بلکہ جماعت کے مختلف افراد کی مخصوص انفرادی حالتوں پر نگاہ رکھنی چاہیے اور جس لحاظ سے بھی بجا طور پر کوئی رعایت کا مستحق ہو اُس کو ویسی ہی رعایت دینی چاہیے۔ اُسے جماعت کو ایسے طریقے پر تربیت دینی چاہیے کہ امیر جو کچھ مشورے اور اپیل کے انداز میں کہے، رفقاء اس کو حکم کے انداز میں لیں اور اس کی تعمیل کریں۔ یہ دراصل جماعتی شعور کی کمی کا نتیجہ ہے کہ امیر کی اپیل اثر انداز نہ ہو اور وہ مجبور ہو کر حکم دینے کی ضرورت محسوس کرے۔ "حکم" تو تنخواہ دار فوج کے سپاہیوں کو دیا جاتا ہے۔ وہ رضا کار سپاہی جو اپنے دل کے جذبے سے اپنے خدا کی خاطر اکٹھے ہوئے ہوں، خدا کے کام میں خود اپنے بنائے ہوئے امیر کی اطاعت کے لیے حکم کے محتاج نہیں ہوا کرتے، ان کو تو صرف یہ اشارہ مل جانا کافی ہے کہ فلاں جگہ تم کو اپنے رب کی فلاں خدمت بجا لانے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ کیفیت جس روز امرائے جماعت اور رفقائے جماعت میں پیدا ہو جائیگی آپ دیکھیں گے کہ آپس کی وہ بہت سی بدمزگیاں آپ سے آپ ختم ہو جائیں گی جو اب وقتاً فوقتاً امیروں اور ماموروں میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔"

اسلامی تحریک میں مناصب کی صفات اطاعت امر کی وضاحت کے بعد مولانا مودودی نے تحریک میں مناصب کے لیے مطلوبہ صفات کا ذکر کرتے ہوئے رودادِ جماعتِ اسلامی حصہ اول صفحہ ۱۳ میں اس طرح کہا ہے:

"امیر کے انتخاب میں آپ کو جو امر ملحوظ رکھنے چاہئیں وہ یہ ہیں کہ کوئی شخص جو امارت کا

اُمیدوار ہو اُسے ہرگز منتخب نہ کیا جائے کیونکہ جس شخص میں اس کارِ عظیم کی ذمہ داری کا احساس ہوگا وہ کبھی اس بار کو اُٹھانے کی خود خواہش نہ کرے گا اور جو اس کی خواہش کرے گا وہ دراصل نفوذ و اقتدار کا خواہش مند ہوگا نہ کہ ذمہ داری سنبھالنے کا۔ اس لیے اللہ کی طرف سے اس کی نصرت و تائید نہ ہوگی۔ انتخاب کے سلسلے میں لوگ ایک دوسرے سے نیک نیتی سے تبادلہ خیال کر سکتے ہیں مگر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف نجویٰ اور سعی نہ ہونی چاہیے۔ شخصی حمایت و موافقت کے جذبات کو دل سے نکال کر بے لاگ طریقے سے دیکھیے کہ آپ کی جماعت میں کون ایسا شخص ہے جس کے تقویٰ، علمِ کتاب و سنت، دینی بصیرت، تدبر، معاملہ فہمی اور راہِ خدا میں ثبات پر آپ سب سے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں، پھر جو بھی ایسا نظر آئے اللہ پر توکل کر کے اُسے منتخب کر لیا جائے۔"

تنظیم میں درجہ و مرتبہ کا معیار: تحریک کے دستور میں آدمی کے درجہ و مرتبہ پر دفعہ ۱۲ میں اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

"اِس جماعت میں آدمی کے درجہ و مرتبہ کا تعین اُس کے حسب و نسب اور علمی اسناد اور مالی حالات کے لحاظ سے نہ ہوگا، بلکہ اس تعلق کے لحاظ سے ہوگا جو وہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کے ساتھ رکھتا ہو اور جماعت کو اس تعلق کا ثبوت اس کی ان نفسی و جسمانی اور مادی قربانیوں سے ملے گا، جو وہ اللہ کے دین کی راہ میں کرے گا۔"

"جہاں تک رکنیت کے حقوق کا تعلق ہے اس میں تمام ارکانِ جماعت مساوی ہیں لیکن جہاں تک اخلاقی فضل و شرف اور نظامِ جماعت میں رہنمائی و پیش روی اور ذمہ دارانہ مناصب کے استحقاق کا تعلق ہے اس کا فیصلہ کسی کی خاندانی وجاہت یا شہرت و ناموری یا دولت و ثروت یا علمی اسناد کی بنا پر نہ ہوگا بلکہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کون اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا زیادہ پابند ہے۔ دین کے فہم اور اس کے مطابق عمل میں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ تحریک اسلامی کے کام چلانے کی زیادہ اہلیت رکھتا ہے اور اس جماعت کے نصب العین کی خاطر وقت و محنت، ذہانت و مال کی بے دریغ قربانی کرنے والا ہے اور اس کے انتخاب میں یہ صفت مدنظر رہے گی کہ نہ وہ امارت کا خود اُمیدوار ہو اور نہ اس سے کسی ایسی بات کا ظہور ہوا ہو جو یہ پتہ دیتی ہو کہ وہ امارت کا خود خواہش مند یا اس کے لیے کوشاں ہے۔

(باقی)

رسائل و مسائل

مخلوط تعلیم اور پردہ پسند طالبات

جامعہ پنجاب کی ایک طالبہ کا خط[1]

آپ کی ایک باپردہ بہن اور قوم کی ایک حساس بیٹی جو جامعۂ پنجاب لاہور میں زیر تعلیم ہے، آپ سے مخاطب ہے۔

مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں خواتین کے لیے کوئی علیحدہ یونیورسٹی نہیں ہے بلکہ نمبروں کے میرٹ کی بنیاد پر انہیں جامعہ پنجاب اور دوسرے کالجز میں داخلہ دیا جاتا ہے اور ہمیشہ جامعہ پنجاب میں طالبات کی تعداد طلبا کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہے۔

چونکہ جامعہ اور کالجز میں تعلیم مخلوط طور پر دی جاتی ہے اس لیے طالبات اور طلبہ کا میل جول ایک لازمی امر ہے جس سے جہاں ایک طرف باہمی مقابلہ کی سپرٹ پیدا ہوتی ہے وہاں دوسری طرف لیکچر تھیٹرز (CLASS ROOM) تجربہ گاہوں

۱؎ عام قاعدے کے طور پر کوئی تحریر بغیر لکھنے والے کے نام کے ہم شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے، مگر بعض صورتوں میں لکھنے والے خود کسی مجبوری کے تحت خواہاں ہوتے ہیں کہ ان کا نام شائع نہ کیا جائے۔ ایسی صورت میں اخفا ہی مناسب ہوتا ہے۔ یہی صورت اس تحریر کی ہے۔ (مدیر)

(LABORTRIES) اور لائبریریز میں ان کے پردہ کا مناسب انتظام نہ ہونے کے سبب ان کو مجبوراً پردہ ترک کرنا پڑتا ہے اور چند ایک باپردہ طالبات آزاد رَو طالبات، طلبہ اور بعض دفعہ پروفیسر صاحبان کے مذاق کا نشانہ بنتی ہیں۔ ایسی صورت میں پابند صوم وصلوٰۃ طالبات ایک عجیب اُلجھن اور انتشار کا شکار رہتی ہیں۔ ایک طرف حصولِ تعلیم کی مجبوری اور دوسری طرف ماحول کی آزادی۔ پھر اس طرح یا تو وہ ذہنی اذیت میں مبتلا رہتی ہیں اور یا پھر خود کو آزاد ماحول کے مطابق ڈھال لیتی ہیں۔ جس سے ہماری پاکستانی ثقافت وتہذیب مسخ اور اسلامی افدار کا تیا پانچہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر سخت دُکھ ہوتا ہے۔ کاش ہماری علیحدہ یونیورسٹی ہوتی۔ چونکہ موجودہ حالات میں مستقبل قریب میں علیحدہ یونیورسٹی کی تشکیل شاید ناممکن ہے اس لیے درج ذیل تجاویز ارسال ہیں جن پر عمل کر کے بغیر اضافی اخراجات اور انتظامی مسائل کے ان اداروں کا ماحول اسلامی بنایا جا سکتا ہے۔

تجاویز

۱۔ تمام شعبہ جات (DEPARTMENTS) میں شعبۂ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب کی طرح لیکچر تھیٹرز (CLASS ROOMS) میں پردہ کلاتھ یا ہارڈ بورڈ (HARD BOARD) کے ذریعے طالبات کی نشستیں (SEATS) علیحدہ (SEPARATE) کی جائیں۔

۲۔ تمام شعبہ جات (DEPARTMENTS) میں طالبات کے لیے سر ڈھانپنا لازم قرار دیا جائے اور عام باریک نمائشی دوپٹہ کی جگہ ایسی چادریں اوڑھنی ضروری قرار پائیں، جن سے نمود و نمائش کی جگہ صحیح چادر کا تقدس نکھرے۔

۳۔ طالبات کے لیے باریک لباس جس سے نیم برہنگی اور عریانی جھلکتی ہے، بالکل ممنوع (BAN) قرار دیا جائے اور چمکیلے بھڑکیلے ملبوسات کی جگہ سادہ اور باوقار لباس لازمی قرار دیے جائیں۔

۴ — طالبات کی آمد و رفت کے لیے علیحدہ اور مخصوص بسوں کا انتظام کیا جائے جن کے مقرر اوقات ہوں اور تعلیمی سفر EDUCATIONAL AND RESEARCH TOURS) میں طالبات کی آمد و رفت، رہائش اور خورد و نوش کا علیحدہ انتظام کیا جائے۔

۵ — سائنس پریکٹیکلز (عملی تعلیم) میں طالبات کے گروپ الگ بنائے جائیں۔ اور ان کو تجربات طلبا سے علیحدہ کروائے جائیں۔ (جامعہ پنجاب لاہور میں ایسی سہولیات میسر ہیں جہاں طلباء طالبات ایک ہی وقت میں علیحدہ علیحدہ تجربہ گاہوں میں تجربات اور ریسرچ کا کام کر سکتے ہیں)۔ اس سے طالبات مکمل یکسوئی، اطمینان اور تسلی سے بہتر طور پر تحقیق کا کام سرانجام دے سکیں گی۔

۶ — یونیورسٹیز کے کتب خانوں (LIBRARIES) اور تمام پبلک لائبریریز میں خواتین کے لیے پردہ کا بندوبست کیا جائے۔ جہاں خواتین کے اوقات مقرر کیے جائیں تاکہ انہیں کتب سے استفادہ کرنے کے بہتر مواقع میسر آئیں اور وہ مکمل دلجمعی سے بہتر ماحول میں اطمینان و تسلی سے تحقیق کا کام کر سکیں۔ جب کہ موجودہ صورت میں یونیورسٹی کتب خانوں سے طالبات، طلبا کی موجودگی اور کتب کے میسر نہ آنے کے باعث صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتیں۔

۷ — لیکچر ہالز / منصوبہ جات (CLASS ROOMS) تجربہ گاہوں (LABORTRIES) اور کتب خانوں (LIBRARIES) میں طلبہ کے لیے سگریٹ نوشی بالکل ممنوع (BAN) قرار دی جائے اور اس پر سختی سے عمل درآمد کروایا جائے۔

ادارے کا جوابی نوٹ

اُوپر ایک صالح ذہن کی طالبہ کے وہ احساسات پیش کیے جا رہے ہیں جو اس میں ایک ناخوشگوار ماحول کے عملی تجربے سے گزرتے ہوئے پیدا ہوئے۔ حجاب کے تقاضوں کے پیش نظر خواتین یونیورسٹی کے وجود میں نہ آنے پر رنج کا اظہار بھی

کیا گیا ہے اور موجودہ صورتِ حالات کے لیے بھی چند اچھی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

ہم عزیز طالبہ کے دردمندانہ جذبات کے لیے اپنے اندر ہمدردی کا گہرا احساس پاتے ہیں۔ اور غیر مخلوط نظامِ تعلیم ہی کے نہیں، غیر مخلوط سوسائٹی کے خواستگار ہیں۔

مگر جس صورتِ حالات سے ہم گزر رہے ہیں وہ بڑی ہی اذیت ناک اور عبرت آموز ہے۔ سامراجی قوتیں جو عسکری حملوں اور سیاسی اقتدار کی قوت سے ہمارے اعتقادی وتہذیبی وجود کو توڑ نہ سکی تھیں انہوں نے ثقافتی ومعاشرتی راستے سے جو حملہ شروع کر رکھا ہے وہ ہمارے تہذیبی تشخص کو ملیامیٹ کرنے میں بہت مؤثر ثابت ہوا ہے اور حملہ آور قوت کا قدم باوجود مزاحمت کے ہر روز آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ حملہ جو فکری وعملی بھی ہے، معاشی ومعاشرتی بھی ہے اور ثقافتی وتمدنی بھی ہے، اس کا ایک ہدف ہمارے خاندانی نظام کو تباہ کرنا اور ہماری محافظِ دین و تہذیب خاتون کو اسلامی تقاضوں کا باغی بنا کے کھڑا کرنا ہے۔ حملہ آور قوت نے خداناشناس اور اخلاق باختہ تہذیب کے جادو سے خود مسلمانوں کے کارفرما اور ذہین طبقوں کو مسحور کر کے اپنا آلۂ کار بنا لیا ہے۔ اب یہ مسحور لوگ جس ساحر قوت کے معمول ہیں اس کے خلاف ذرہ بھر جنبش نہیں کر سکتے۔ یہ اول تو اسلام کے لیے نعروں اور تقریروں سے آگے نکل کر کوئی ٹھوس کام کرتے ہی نہیں اور اگر عوام کو نمائش دکھاتے بلکہ بہلانے کے لیے کوئی اقدام کرتے بھی ہیں تو اس میں سیوں طرح کی خرابیاں شامل ہوتی ہیں۔ یہ خواتین یونیورسٹی تو کیا بنا کر دیں گے ان کے موجودہ تعلیمی اداروں میں اسلامی قوانینِ حجاب کے تحت مناسب اصلاحات کی توقع کرنا بھی عبث ہے۔ یہ بالارادہ مخلوط تعلیم، مخلوط ثقافتی مجالس، مخلوط پارلیمان اور مخلوط کھیل تفریحات کا فروغ چاہتے ہیں۔ ان کے سایۂ فیضان میں ٹیلی وژن گھر گھر میں بے پردگی کی معلمی کا مقدس فریضہ انجام دے رہا ہے۔ فحش لٹریچر پھیل رہا ہے۔

ارباب ادب فحاشی کی ایسی ایسی تعریفیں نکال رہے ہیں کہ لفظ فحاشی کے مفہوم سے فحاشی خارج ہو جائے ۔ بڑے بڑے سائز کی ہوس انگیز تصاویر اور اندرونِ خانہ کی ازدواجی زندگی کی تفاسیر ہر روز اخبارات گھر گھر پہنچاتے ہیں ۔ ناچ کو اب اسلامی فن کہا جانے لگا ہے ۔ گانوں کا زور ہے، وڈیو کیسٹ نے گندگی کے دروازے کھول دیئے ہیں ۔ اور اُوپر ہمارے مہربان بیٹھے اسلام اسلام کی رٹ لگا رہے ہیں۔

عزیز بیٹی ! اِن حالات میں ہم لوگوں کی طرح تم بھی اس عزم کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ کہ جو تعلیم جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بسر کرنے کے لیے دی ہے، مجھے اسی پر قائم رہنا ہے اور مزاحمتوں اور مجبورانہ آلائشوں کے باوجود اس سے قدم پیچھے نہیں ہٹانا ہے ۔ پیروانِ محمدؐ تو ہیں ہی وہی جو مخالف ترین ماحول میں اپنے آقا کے بنائے ہوئے نشاناتِ راہ کی کڑی پابندی اختیار کریں ۔

اگر یہ عزم ہو اور اس کے ساتھ منظم طور پر اسی شعور و جذبہ کو دوسری سہیلیوں، بہنوں اور رشتہ داروں تک پہنچانے کی مہم جاری کر دی جائے تو وہ وقت آسکتا ہے کہ حجاب پسند خواتین اور طالبات کا اثر و نفوذ معاشرے اور درس گاہوں میں ہو اور اُن کی آواز جماعتوں اور اخباروں کے ذریعے اتنی بلند ہو کر اُٹھے کہ مسحورانِ مغربیت کی پینک ٹوٹ جائے اور ان کو چار و ناچار وہ راہ اختیار کرنی پڑے جو حق ہے ۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے ۔ (ادارہ)

مطبوعات

التنقیر یہ رد التحذیر از مولینا سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی و مولینا غلام اللہ اوکاڑوی
ناشر: مکتبہ فریدیہ، جناح روڈ، ساہیوال۔ قیمت: ۵/ روپے

یہ مولینا محمد قاسم نانوتوی کے رسالے "تحذیر الناس" کا مناظرانہ جواب ہے۔ اس کے دیباچے میں حافظ نعمت علی چشتی کا یہ فقرہ پڑھ کر رنج ہوا کہ (مولینا احمد سعید شاہ کاظمی نے) "مولوی محمد قاسم نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی نام نہاد علمیت کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوڑا ہے"۔ دین کے خادموں اور کتاب و سنت کے حاملوں کا طریقہ آپس میں افہام و تفہیم تو ہوسکتا ہے، بھانڈے پھوڑنے کے کھیل انہیں زیب نہیں دیتے۔ اس روش سے الحاد کی زد میں آئے ہوئے معاشرے کی تارک الدین اکثریت میں دین سے اور زیادہ بُعد پیدا ہوتا ہے۔

اس رسالے میں "تحذیر الناس" کی چودہ غلطیاں پکڑی گئی ہیں اور ان پر خوب بحث کی گئی ہے۔ بحث سے پہلے اصل ضرورت مولینا محمد قاسم کے نفسِ مضمون اور مدعا کو سمجھنے کی ہے۔ مولانا نانوتوی نے ابن عباسؓ کے اثر کو قبول کرتے ہوئے سات ایسی زمینوں کا تصور کیا ہے جن میں ذوی المعقول آباد ہیں یا ہوسکتے ہیں اور ان کے لیے نظامِ ہدایت اور سلسلۂ نبوت و الہام ہونا چاہیے۔ کہیں ایسی مخلوق حال میں ہوسکتی ہے، کہیں ماضی میں رہی ہوگی اور کہیں مستقبل میں نمودار ہوسکتی ہے۔ کوئی چاہے تو اثر ابن عباس کو بہ بنائے دلائل نہ مانے، مگر ماننے والے بھی ہوسکتے ہیں، خصوصاً اہل تصوف میں۔ علامہ اقبال نے

بھی اس تصوّر کے تحت یہ کہا کہ:

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃٌ للعالمینے ہم بود
یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ ست

اب اس تصور کے ماننے والوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کائنات کے بعید ترین گوشوں میں کہیں بھی حیات ہے اور کوئی ذی عقل مخلوق پائی جاتی ہے تو کیا اس کے لیے نبی و رسول ہونے چاہئیں یا نہیں؟ اگر ہونے چاہئیں تو سوال یہ ہے کہ جہاں یہ سلسلہ ہماری زمین سے پہلے چل کر خاتمیت تک پہنچ چکا، یا جہاں یہ سلسلہ ہمارے متوازی جاری ہے یا جہاں یہ سلسلہ مستقبل میں مکمل ہوگا یا بعد ہی میں آغاز کرے گا۔ وہاں کے انبیاء کے متعلق حضورؐ کے خاتم النبیین ہونے اور "لا نبی بعدی" کے ہوتے ہوئے کیا حکم لگایا جائے گا؟ یہ وہی آبادیاں ہیں جن کے انبیاء کو آپ کے حوالہ کے مطابق صوفیا نے ہماری زمین کے مقدسین کے "حقائق مثالیہ" قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں کئی سوال حل طلب ہیں۔ مثلاً یہ کہ ولقد کرمنا بنی اٰدم الخ میں کرامتِ آدم سے کیا یہ مراد ہے کہ تمام سابق، موجودہ یا آئندہ کائنات میں آدم کو افضلیت دی گئی ہے؟ حالانکہ شرف و کرامت کے مختلف مدارج مختلف جگہ پائے جاتے ہیں۔ نیز بنی آدم کی ایک وہ عمومی کرامت ہے جو "وحملنا ھم فی البر والبحر" کے اشارہ سے بیان کی گئی ہے اور اس میں مومن و کافر سب شریک ہیں، دوسری حقیقی کرامت وہ ہے جو صرف اہلِ ایمان و تقویٰ کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ سوال کہ رحمۃٌ للعٰلمین کے دائرۂ مفہوم میں تمام کائنات کو لیا جائے یا جملہ انسانی نسلوں اور اقوام کو؟ پھر یہ سوال کہ کیا دوسرے امکانی عوالم کے خاتمینِ رسالت کو حضورؐ کے اتباع میں شمار کیا جائے؟ وغیرہ یہ سارے سوال کسی نہ کسی شکل میں تحذیر الناس میں زیرِ بحث آتے ہیں۔

اسی سلسلے میں وہ باتیں آتی ہیں جن کا اطلاق اگر محض آدمیانِ زمین تک محدود کر دیا جائے تو وہ الجھنیں پیدا کرتی ہیں مثلاً یہ جملہ کہ "انبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض لے کر امتیوں کو پہنچاتے ہیں" یا "اور انبیاء میں جو کچھ ہے وہ ظل اور عکسِ محمدی ہے"۔

یا یہ کہ "کمالاتِ انبیائے سابق اور انبیائے ماتحت کمالاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفاد ہیں"۔

واضح رہے کہ یہاں یہ امر بعید ترین امکان کی حد تک بھی مراد نہیں کہ حضورؐ کے بعد اس زمین پر کمالات نبوی سے فیض پا کر کوئی دوسرا نبی اُنہیں میں سے اُٹھے۔

کسی کو اختلافی بحث کرنی ہو تو وہ اصل بنائے بحث پر کرے، نہ یہ کہ اس کے فروع پر۔

اِس گفتگو کے یہ معنی نہیں کہ راقم رسالہ تحذیر الناس میں درج شدہ ہر عبارت کو صحیح سمجھتا ہے۔ مولینا نانوتوی کے کئی ذاتی نظریات ایسے ہیں جن سے میں مطمئن نہیں ہو سکا، مثلاً "انبیا اپنی امت سے اگر ممتاز ہوتے ہیں تو علوم ہی میں ممتاز ہوتے ہیں، باقی رہا عمل تو اس میں بسا اوقات بظاہر اُمتی مساوی ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بڑھ بھی جاتے ہیں"۔ اگرچہ اس میں لفظ "بظاہر" جملے کا اچھا مصلح ہے اور اس کی وجہ سے واقعات کی تاویل و تعبیر کی راہیں کُھل جاتی ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اظہار مدعا کے لیے اس سے بہتر عبارات اختیار کرنی چاہئیں۔

بہرحال اصل رسالہ تحذیر الناس کے بخلاف ردِّ تحذیر کا انداز حریفانہ اور مناظرانہ ہو گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اگر بحث اصل موضوع اور متعلقات پر مثبت انداز سے اور متوازن طریق سے ہوتی تو خالص علمی لٹریچر میں مفید اضافے کے ساتھ دین کی زیادہ بہتر خدمت ہوتی۔ اب تو نقشہ محاذ آرائی اور چوراہے میں علم کی ہنڈیا پھوڑنے کا ہے۔

پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ کئی مفید نکات اس جوابی رسالے میں بھی موجود ہیں۔

(بقیہ اشارات)

اِن اشارات سے مدّعا یہ عرض کرنا ہے کہ انتخابی نتائج صرف وہی نہیں ہیں جو "سیٹوں" کی شکل میں ملے ہیں، بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔ انتخابی کام کی ان ساری افادیتوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے محبانِ اسلام پر بڑا اکرم فرمایا ہے۔

مذکورہ کامیابی جن ناساز گار حالات میں ہوئی ہے وہ ضرور پیشِ نظر رہنے چاہئیں خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ یہ انتخابات ایک طرح سے اضطراری نوعیت رکھتے ہیں۔ کئی برس تک گھٹن میں رہنے کے بعد جب انتخابی دروازہ یکایک کھلتا ہے تو اندر سے ریلے کا ریلا اس انداز سے نکلتا ہے کہ قوم کی سوچنے کی قوتیں زیادہ اچھی طرح کام نہیں کرتیں۔ اس کا اندازہ ہر انتخابی حلقے میں مقابلے کے لیے اُٹھنے والے طرح طرح کے اُمیدواروں کی کثرتِ تعداد سے کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بار بار ایسے حالات پیدا ہوئے کہ گومگو کی حالت طاری ہو جاتی رہی۔ انتخابات ہوں گے یا اور آگے ٹلیں گے؟ جماعتی ہوں گے یا غیر جماعتی؟ بائیکاٹ کے نعروں کا کیا اثر پڑے گا؟ تخریبی عناصر کوئی خلل تو پیدا نہیں کریں گے؟ جمہوریت مارشل لاء کے ساتھ کیسے چلے گی؟ حکومت انتخابات کے کھیل کو خود تو خفیہ طور پر کنٹرول نہیں کرے گی؟ نظریات اور منشوروں کے بغیر آنے والے قسم قسم کے افراد مل جل کر چل بھی سکیں گے یا نہیں؟ دستور ۱۹۷۳ء کا کیا بنے گا؟ ترامیم جمہوری عمل میں قدم قدم پر رکاوٹ کا باعث تو نہیں بنیں گی؟ صدر اور وزیر اعظم اور اسمبلی میں کیسے ہم آہنگی پیدا ہو سکے گی؟ ایم آر ڈی کے لیڈروں کی سیاست پولنگ کی تاریخ سر پر آ جانے کے بعد یکایک سارا تانا بانا اُدھیڑنے کا باعث تو نہیں بنے گی؟ آج ایک قاعدے کا نفاذ اور کل اُس کی منسوخی کا سلسلہ کوئی نامناسب شکل تو نہ پیدا کر دے گا؟ وغیرہ سوالات ایسے تھے جنھوں نے قوم کے ذہنی سکون کو تہ و بالا کر رکھا تھا۔

۳۔ انتخابی تیاری کے لیے نہ صرف مہلت کم تھی بلکہ غیر جماعتی فضا میں اُمیدواروں پہ جلسے جلوسوں اور لاؤڈ اسپیکر کی پابندیاں اور پابند پریس کو ذریعہ اظہار بنانے کی مشکلات، ایسی بھاری تھیں کہ بڑے بڑے حلقوں میں ۸۰ ہزار یا ۱½ لاکھ ووٹروں کی تعداد سے رابطہ کرنا آسان نہ تھا۔

۳ — ہماری بڑی مشکل یہ تھی کہ ہمارے کارکن شروع سے جماعتی اور تنظیمی فضا میں کام کرنے کے عادی تھے، مگر اب اُن کے سر غیر منظم[1] صورت میں انتخابی مہم کی ذمہ داری آ پڑی تھی۔ اس کمزور پہلو ہی کی وجہ سے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ انتخابی فیصلے براہِ راست ایک مرکز سے کرنے کے بجائے زیادہ تر کام مقامی لوگوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کہاں انتخابات میں حصہ لیا جائے اور کہاں نہیں، اور کون شخص کس جگہ سے کھڑا ہو اور کیسے لوگوں کا مقابلہ نہ کیا جائے اور کس طرح کے اُمیدواروں کی حمایت کی جائے، ان تمام اُمور کو عملاً مقامی اور علاقائی قوت کے حوالے کر دیا گیا۔ اِس صورتِ حالات میں ہمارے تصورات سے کہیں زیادہ تعداد[2] مختلف حلقوں سے کھڑی ہو گئی جب کہ مخالف و موافق حالات کا صحیح تجزیہ نہیں کیا گیا۔ اور کہیں حلقے نامناسب تھے اور کہیں افراد ناموزوں[3]۔ پھر دینی حلقوں اور محبِ اسلام شریف آدمیوں سے افہام و تفہیم کے دروازے اِ چند مثالوں کے سوا، قریب قریب بند رہے۔

اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کیے بغیر جو معرکہ آرائی کی گئی اس میں جتنے نتائج نکلے ہیں وہ ہماری توقعات سے زیادہ ہی ہیں۔

---

[1] ساڑھے سات برس سے "کالعدم" چلی آنے والی جماعت کے سابق قائدین اور کارکنان آپس میں کتنے ہی رابطے کیوں نہ رکھیں، وہ مکمل طور پر فعال جماعتی نظم کی برکات نہیں پا سکتے۔

[2] اصل میں اُمیدواروں کی اِسی تعداد کے ساتھ کامیاب ہونے والوں کا تناسب جب دیکھا اور دکھایا جاتا ہے تو ایم آر ڈی سے لے کر بی بی سی تک یہ تاثر سامنے آتا ہے کہ جماعت کو بڑی عظیم کامیابی ہوئی اور ان آوازوں سے متاثر ہو کر خود ہمارے اپنے حلقوں میں بھی بعض اصحاب اپنے چہروں پر احساسِ کمتری و ناکامی کی جھلک پیدا کر لیتے ہیں۔

[3] بعض حلقوں کے متعلق ہمارے اہم اصحاب پہلے سے جانتے تھے کہ یہاں کامیابی ممکن نہیں ہے، مگر کالعدم جماعت کو مضبوط نظم کا وہ ہاتھ حاصل ہی نہ تھا کہ ان حلقوں میں جو گھوڑے دوڑ چکے تھے ان کو روکا جا سکتا۔

اگر حالات دوسرے ہوتے اور پوری جماعت منظم مشینری کے ساتھ میدان میں آتی اور کسی اچھے اور واضح منشور کی طرف قوم کو بلاتی تو معرکہ زیادہ پُر زور ہوتا۔ مگر اب تو بکھرے ہوئے افراد نے مقامی دوستوں کی مدد سے اپنی اپنی جگہ اقدام کیا ہے۔

۴ — پوری پوری جماعتی رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے ہماری انتخابی جدوجہد کی تکنیک، ہمارے دوستوں کا لٹریچر، ان کی تقریروں کا مواد اور انداز نیز ان کے موضوعات اور اصطلاحات ۱۹۵۰ — ۵۱ والا رنگ اپنے اندر لیے ہوئے تھے۔ گویا ہم وقت سے تیس پینتیس برس پیچھے کھڑے تھے۔

۵ — اگرچہ اس بات کی کوئی واضح علامت نہیں کہ مجموعی طور پر انتخابات ۸۵ کی باگ ڈور حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہو، مگر مقابلہ کرنے والے افراد کی طرف سے روپے سے ضمیروں کی خریداری اور برادریوں کی عصبیتوں سے ذہنوں کو مفلوج کرنے اور طرح طرح کی بدعنوانیوں سے انتخابات کو خراب کرنے کی افسوسناک کوششیں کی گئی ہیں (بعض حلقوں میں تو یہ غیر معمولی سطح تک پہنچیں) ان کے علی الرغم ہمارے دوستوں کی جتنی تعداد کامیاب ہو کے نکلی ہے وہ یہ اُمید دلاتی ہے کہ ٹھوس کام کر کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی حیلوں اور حربوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال حالات کے غیر موزوں ہوتے ہوئے، اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کے بغیر جو معرکہ آرائی کی گئی اس سے جتنے نتائج نکلے ہیں۔ وہ ہماری توقعات سے کم نہیں، زیادہ ہی ہیں۔

اب ذرا کام کے ایک نازک گوشے کی طرف توجہ!

گذشتہ دور کے تمام انتخابات میں ہماری مضبوط روایت یہ رہی ہے کہ ایک ایک علاقے میں ہونے والے کام کا پورا پورا احتساب کر کے یہ جائزہ لیا جاتا رہا ہے کہ اصولی، قانونی اور اخلاقی لحاظ سے کیا کیا غلطیاں کی گئی ہیں۔ پھر ان غلطیوں کو متعلقہ کارکنوں کے سامنے لانے کے ساتھ ساتھ ان کے تدارک کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ اب اگرچہ اس درجہ کا منظم اور معیاری اہتمام شاید نہ ہو سکے۔ لیکن مقامی لوگوں کو بھی اور برتر حضرات کو بھی چھان کرید کر کے اچھی طرح معلوم کرنا چاہیے کہ ہم نے کہاں کہاں کیا کیا کمزوریاں دکھائی ہیں۔ اس معاملے میں نہ کسی کا شخصی لحاظ کرنا چاہیے اور نہ معلومات

سامنے آنے پر لیپا پوتی یا ٹال مٹول سے کام لینا چاہیے۔ غلطی کسی فرد سے ہوئی ہو یا کسی ٹیم سے، اتنا ایمان ضرور زندہ ہونا چاہیے کہ خدا سے بہ عجز و الحاح عفو طلب کی جائے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ۔

میں یہاں غلطیوں کی کوئی فہرست تو درج نہیں کر سکتا کہ اس غرض کے لیے نہ پورا پورا انتظام مجھے حاصل ہے اور نہ بہ حیثیت "اشارات نگار" ایسی تفصیلات پیش کرنا ضروری ہے۔ یہ جن کا کام ہے وہی کریں گے۔

مجھے تو صرف اتنا کہنا ہے کہ مختلف مقام اور حلقوں کے متعلق ہمارے اُمیدواروں یا ان کے کارکنوں کی کچھ نہ کچھ زیادتیوں اور کوتاہیوں کی اطلاع مجھے بھی ملتی رہی ہے۔ اس کے ساتھ زیادہ اذیت ناک شکایت یہ بھی سامنے آئی ہے کہ تنقید و احتساب کا شرعی فرض ادا کرنے والوں کو ناخوشگوار تجربات ہوئے ہیں۔ بعض صورتوں میں آگے سے منہ نوچنے والے جواب ملے ہیں۔ اور بعض صورتوں میں کسی سنجیدہ معاملے کو تضحیک یا بے اعتنائی کا نشانہ بنا دیا گیا ہے۔ اس قسم کی جس کسی کو بھی شکایت ہوئی ہو، میں اپنے پورے ساتھیوں کی طرف سے اُس سے معافی مانگتا ہوں جس کسی کی طرف سے بھی ایسی اذیت رسانی ہوئی ہو، وہ بھی متعلقہ شخص یا اشخاص سے معذرت طلب کرے۔

تنقید و احتساب کرنے والا اپنے اندر کا کوئی فرد ہو یا باہر کا، وہ حقیقت کے اعتبار سے ہمارا محسن ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے شکر گذار ہوں۔ اور اس کے لیے بھلائی کی دعا کریں۔

اگر اس کی شکایت درست ہو تو اگر مگر کیے بغیر سر جھکا دیں اور اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ اور جو خرابی سامنے آئے اس کا ازالہ کریں۔ اس معاملے میں خواہ مخواہ اپنی ناک اُونچی رکھنے کے لیے غلطی کی تاویلیں بے جا کر کے غلطی میں اور زیادہ اضافہ کرنا سخت نامناسب ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ یہ نئے حالات کی نئی ضرورت ہے، ایک ایسی بات ہے جسے دوسروں سے سُن کر ہمیشہ ہم نے اس کی تردید کی ہے۔ کیونکہ یہ جملہ ایک ایسی کلید ہے جس سے ماڈرن اور سیکولر طبقے کے لوگ دینی تقاضوں سے انحراف کے دروازے کھولتے ہیں، یا یہ کہنا کہ انتخابی کشمکش میں حریفوں کے سے حربے اختیار

کیے بغیر جیتنا ممکن نہیں ۔ یہ دلیل اگر قبول کر لی جائے تو حریفوں کے پیچھے چل کر ہم نہ جانے کہاں جا پہنچیں گے ۔ ہمارا اصول "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ" ہی رہے گا ۔ اسی طرح بعض افراد کی زبانوں سے ہم نے "الحرب خدعۃ" کا مشہور قولِ مسنون سنا جس کا انطباق ناجائز شکل میں کیا گیا ۔ اس ارشاد کو پہلے جن لوگوں نے غلط معنوں میں استعمال کیا ہے، ان کی تردید ہمارے لٹریچر میں موجود ہے ۔ اب اگر خود اپنے ہی قائم کردہ نقطۂ نظر کے خلاف ہم اسے استعمال کریں تو یہ ہمارے زوال کی علامت ہوگی ۔

اگر کسی کی شکایت نادرست ہو تو نرمی سے اس کے سامنے حقیقتِ حال کی وضاحت کی جائے اور اس کی غلط فہمی رفع کر دی جائے ۔

بخلاف اس کے، اگر ہم لوگ احتساب کی زبانوں کو اپنے جوابی طرزِ عمل سے بند کر دیں تو ایک طرف تو ہم بندگانِ خدا کو ان کے شرعی فریضے سے روکیں گے جس کے نتیجے میں عام بددلی پیدا ہوگی ۔ اور لوگوں میں یاس انگیز چہ میگوئیاں کرنے کا رجحان پیدا ہوگا، دوسری طرف ہم اپنے چہروں پر آنے والی خراشوں اور جبینوں کے داغوں کو دکھانے والے آئینوں کی مدد سے محروم ہو کر ایک غلطی سے دوسری غلطی کی طرف سفر کرتے چلے جائیں گے ۔

کوئی نظمِ جماعت اقامتِ دین اور اتباعِ شریعت کا حق اس کے بغیر ادا نہیں کر سکتا کہ اس میں تنقید و احتساب کرنے کے لیے بے جھجک زبان کھولنے والے اور ان کی بات کو صبر و رواداری سے سننے والے موجود رہیں ۔ تنقید کرنے والے بولیں نہیں تو ان میں خیر نہیں، سننے والے اگر سنیں نہیں تو ان میں خیر نہیں ۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ۵۰ سالہ تشخص کے چہرے کو مسخ ہونے سے بچائیں ۔ ہمیں اس خطرے کو محسوس کرنا چاہیے کہ ایک طرف ہمارے اندر کچھ عرصہ سے کجی بھرتی ہو رہی ہے اور دوسری طرف اعتقادی و اخلاقی لحاظ سے زخم خوردہ دوستوں کو ہم سابق معمول کے بخلاف اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتے ۔ ایسی صورت میں مفسدات سے بھرے ہوئے ماحول کا دباؤ نہ صرف انتخابی میدان میں، بلکہ پوری زندگیوں میں ہمیں آہستہ آہستہ مغلوب کر رہا ہے ۔ کتنی ہی بدعات، کتنے غلط رسم و رواج، کتنی ہی نا روا تقریبات، کتنے تہذیب نو کے فتنے، کتنی بے جا تفریحات ہم پر اثر انداز ہیں ۔ تصویر کے

معاملے میں، موسیقی کے معاملے میں، پردے کے معاملے میں، اولادوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں، برادرانہ رابطوں اور باہمی ایثار کے معاملے میں، نظم کے معاملے میں، پابندیٔ وقت کے معاملے میں، اسراف و تبذیر کے معاملے میں غیر محسوس طریق سے جو لچ پائی ہو رہی ہے۔ اس کا شعور و احساس اپنے ہی سابق لٹریچر کا بغور مطالعہ کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ انتخابات میں جو غلط چیزیں واقع ہوئی ہیں، اُن پر تنقید بھی سُنی جائے۔ ان کا احتساب خود بھی کیا جائے اور ان پر گرفت کر کے ان کے تدارک کی پوری کوشش بھی کی جائے۔

اب نئے حالات کے تحت جامع منصوبہ بندی کے ساتھ پُرزور کام کرنے کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے جس کے حسبِ ذیل تقاضے سامنے ہیں:۔

۱۔ پارلیمنٹری دائرے میں ضروری دفاتر کا قیام، نئے فرائض کے لیے منتخب نمائندوں کی تیاری و تربیت اور پارلیمانی حلقوں میں رابطے۔

۲۔ اپنے منتخب شدہ نمائندوں کے لیے ان کے اپنے حلقوں میں سرگرمی سے سوچے سمجھے خطوط پر کام کرنے کا منصوبہ۔

۳۔ پچھلی انتخابی مہم کے رابطوں کو جاری رکھنا اور متاثرین اور حامیوں کو قریب تر لانا۔

۴۔ آئندہ کے لیے ملک میں حلقہ ہائے انتخاب کو پیش نظر رکھ کر ۵ سال کے لیے ایسے بھرپور دعوتی اور خدمتی کاموں کا نقشہ بنا کر چلنا اور اپنے ربط و اثر کو اتنا مضبوط کرنا کہ آئندہ کے لیے اتنی مستحکم بنیاد بن جائے کہ حتمی طور پر پہلے سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ یہاں ہم دولت، برادری اور ہر قسم کی بدعنوانیوں کا مقابلہ کر کے بھی جیت سکیں گے۔

سو تحریکِ غلبۂ اسلام کے سپاہیوں سے میں دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ کمر ہمت باندھ کر ایک بار مجاہدوں کی طرح نکل کھڑے ہوں اور تہیہ کر لیں کہ اگلے پانچ سال کے عرصے میں انہیں حالات کو اپنے حسبِ منشا زیر و زبر کر دینا ہے۔

خدا مجھے اور آپ کو اپنی رہنمائی اور تائید سے نوازے! آمین۔

اپریل ۱۹۸۵ء

تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لیے بہترین زادِ راہ

تحریک اور کارکن

تالیف

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب

خلیل احمد حامدی

سائز ۲۲×۱۸/۸ ۰ آفسٹ پیپر ۰ مجلد ڈاکی دار

قیمت ــــــ ۳۰/- روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ ـ دربار مارکیٹ لاہور